قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ہفتہ وار طلوعِ اسلام کراچی

جلد نمبر ۸ شمارہ ۲۱ | کراچی: ہفتہ - ۲۵ - جون ۱۹۵۵ء | قیمت چار آنہ سالانہ دس روپے

قرآن نے کیا کہا؟

یہ لوگ جو اپنے فرقوں کو نہیں چھوڑنا چاہتے وہ قرآن کیطرف دعوت دینے والے کے جانی دشمن بن جاتے ہیں - وہ قرآن سے خود بھی اعراض برتتے اور پہلوتہی کرتے ہیں اور دوسرے لوگوں کو بھی اس کے قریب آنے سے روکتے ہیں - وھم ینھون عنه و ینئون عنه (۶/۲۶) وہ لوگوں کو اس سے روکتے ہیں اور خود بھی اس سے پہلوتہی کرتے اور دور دور رہتے ہیں - یہ لوگ قرآن سے علانیہ انکار تو نہیں کر سکتے اس لئے وہ چاہتے یہ ہیں کہ قرآنی تعلیم میں کچھ ایسا تغیر و تبدل کردیا جائے جس سے وہ تعلیم ان کے فرقے کے مسلک کے مطابق بن جائے - اور اگر اس قسم کے رد و بدل کی گنجائش نہ ہو تو پھر یہ عقیدہ پیدا کرلیا جائے کہ وحی ساری قرآن ہی کے اندر نہیں - اس قرآن کے علاوہ اور بھی وحی ہے جو اسی کی مثل ہے - واذا تتلیٰ علیھم آیا تنا بینٰت - قال الذین لا یرجون لقائنا ائت بقرآن غیر ھذا او بدله (۱۰/۱۵) جب ان لوگوں کے سامنے ہماری واضح آیات قرآنی پیش کی جاتی ہیں تو وہ لوگ جو نہیں چاہتے کہ ہمارا قانون ان کے سامنے آئے کہتے ہیں کہ تم اس قرآن کے علاوہ کوئی اور قرآن پیش کرو - یا اس میں تغیر و تبدل کردو - قل ما یکون لی ان ابدله من تلقائی نفسی - اے رسول تم ان سے کہدو کہ میری کیا طاقت ہے کہ میں اس میں اپنی طرف سے رد و بدل کردوں - ان اتبع الا ما یوحیٰ الی (۱۰/۱۵)-میں تو صرف اسکی اتباع کرتا ہوں جو میری طرف وحی کیا جاتا ہے -

طلوعِ اسلام کا مسلک اور مقصد

ہمارا مسلک یہ ہے کہ ....

۱. تنہا انسانی عقل زندگی کے مسائل حل کرنے کے لئے کافی نہیں۔ اسے اپنی راہنمائی کیلئے اسی طرح وحی کی ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی۔

۲. یہ وحی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم میں محفوظ ہے۔ اس لئے نوعِ انسانی قرآن کے بغیر اپنی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتی۔

۳. حق اور باطل کا معیار قرآن ہے۔ ہر وہ بات جو قرآن کے مطابق ہو گی صحیح ہو گی جو اس کے خلاف ہے غلط ہے۔

۴. حضور نبی کریم انسانی سیرت و کردار کے بلند ترین مقام پر فائز تھے لیکن عجمی سازشوں نے ہماری تاریخ میں ایسی چیزیں شامل کر رکھی ہیں جن سے حضور کی سیرت داغدار ہو کر سامنے آتی ہے۔ ہماری نگاہ کے سامنے تمام حصے (خواہ وہ کسی کتاب میں ہوں) یکسر غلط اور وضعی ہیں۔ حضور کی سیرت کا معیار خود قرآن کریم ہے۔

۵. قرآن کی رو سے دنیا میں بسنے والے تمام انسان ایک عالمگیر برادری کے افراد ہیں۔ اس برادری کے قیام کی عملی شکل یہ ہے کہ تمام دنیا ایک نظام کے مطابق زندگی بسر کرے۔

۶. اس عالمگیر نظامِ زندگی کی تشکیل کی صورت یہ ہے کہ ہر زمانے کے انسان اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق قرآن کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں باہمی مشاورت سے جزئی قوانین خود مرتب کریں (انہیں قانونِ شریعت کہا جا سکتا ہے)۔ یہ جزئی قوانین حالات کی تبدیلی سے بدلتے رہیں گے لیکن قرآن کے اصول ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے۔

۷. اس نظام کی رو سے قرآن ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کرتا ہے جس میں تمام افراد کی مضمر صلاحیتوں کی کامل نشوونما ہو جاتی ہے اور کوئی فردِ معاشرہ اپنی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہیں رہتا۔ اسے ربوبیتِ عامہ یعنی تمام نوعِ انسانی کی پرورش سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

۸. ربوبیتِ عامہ کے مقصدِ عظیم کے حصول کے لئے قرآن کی رو سے ضروری ہے کہ رزق کے سرچشمے افراد کی ملکیت کے بجائے معاشرے کی تحویل میں رہیں تاکہ رزق کی تقسیم ہر ایک کی ضرورت کے لحاظ سے ہوتی رہے اور اس طرح کوئی انسان دوسرے انسان کا محتاج نہ رہے۔ اسے "قرآنی نظامِ ربوبیت" کہا جاتا ہے۔

ہمارا مقصد یہ ہے کہ ....

پہلے پاکستان میں اور اس کے بعد ساری دنیا میں قرآنی نظامِ ربوبیت نافذ ہو جائے تاکہ صفاتِ خداوندی کی روشنی میں ہر انسان کی مضمر صلاحیتیں کامل نشوونما پا سکیں اور اس طرح "زمین اپنے پرورش دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے"۔

اگر آپ طلوعِ اسلام کے اس مسلک و مقصد سے متفق ہیں تو اس پیغام کو عام کرنے میں طلوعِ اسلام کا ساتھ دیجئے

اس شمارے میں

- ★ اسلامی نظام
- ★ تاریخی شواہد
- ★ حقائق و عبر
- ★ امریکی امداد
- ★ مجلس اقبال
- ★ عالم اسلامی
- ★ انڈیا آفس لائبریری
- ★ گوآ
- ★ بین الاقوامی جائزہ
- ★ عورت کا قرآن
- ★ اندرون ہند
- ★ بزم طلوع اسلام
- ★ اسلام کی سرگزشت

اسبابِ زوالِ امت

قیمت -/۸/۱ روپیه

سلیم کے نام خطوط

سلیم جدید تعلیم یافته نوجوان طبقه کا نمائنده ہے۔ اس کے نام خطوط میں ان شکوک و شبہات کا ازاله کیا گیا ہے جو زمانے کے تقاضوں کے ہاتھوں ان کے دل میں لامحاله پیدا ہوتے ہیں۔

صفحات ۳۰۸ قیمت چھ روپے

ابلیس و آدم

کیا انسان موجوده شکل میں اچانک پیدا ہو گیا؟ یا اس کی تخلیق ایک مسلسل عمل ارتقاء کا نتیجه ہے؟ سلسله ارتقاء کیا ہے؟ مغرب کے ماده پرست کیا نظریه رکھتے ہیں؟ اور قرآن کیا تصور دیتا ہے؟

اس کی تفصیل "ابلیس و آدم" میں ملاحظه کیجئے۔

ضخامت ۳۷۶ قیمت آٹھ روپے

فردوس گم گشته

پرویز صاحب کے گراں بہا مقالات اور تقاریر کا مجموعه جس سے قرآنی حقائق کے مختلف گوشے بیک وقت سامنے آجاتے ہیں۔

صفحات ۳۱۶ قیمت چھ روپے

اسلامی نظام

قیمت -/-/۲ روپے

ناظم اداره طلوع اسلام - پوسٹ بکس نمبر ۷۳۱۳ - کراچی ۲

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ہفت روزہ

طلوعِ اسلام

جلد ۸	۲۵ جون ۱۹۵۵ء	نمبر ۲۱

اسلامی نظام

(۲)

سابقہ اشاعت میں اس حقیقت کو سامنے لایا گیا تھا کہ ہمارے ہاں اسلامی نظام کا مطالبہ تو عام ہے۔ لیکن اس کا کوئی متعین تصور کسی کے ذہن میں نہیں اور اس کے ماخذ و مبانی کے متعلق مختلف فرقوں اور پارٹیوں کا باہمی اتفاق نہیں۔ نہ ہی ایسا اتفاق ممکن ہے۔ یہ واضح ہے کہ جب آپ کسی مملکت کا آئین مرتب کرتے ہیں۔ اور اس آئین کی بنیاد "کتاب و سنت" قرار دیتے ہیں۔ تو یہ ضروری ہے کہ ان دونوں چیزوں (کتاب اور سنت) کے متعلق یقینی اور متعین طور پر معلوم ہو (اور آئین میں اس کی صراحت کی جائے) کہ کتاب کسے کہتے ہیں اور سنت کیا ہے اور وہ کہاں ملیگی؟ سنت کے متعلق ہم بتا چکے ہیں (اور آپ ذاتی طور پر اس کی خود تحقیق کر کے دیکھ لیجئے) کہ

(۱) اس کا کوئی متعین مفہوم ایسا نہیں جو تمام ملتِ پاکستان کے نزدیک متفق علیہ ہو۔

(۲) ایسی کوئی کتاب نہیں جس کے متعلق سب کو تسلیم ہو کہ اس میں جو کچھ درج ہے سب کا سب حتمی اور یقینی طور پر سنتِ رسول اللہؐ ہے۔

(۳) سنت کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ یہ "رسول اللہؐ کا ثابت شدہ طریقہ" ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ جو طریقہ کسی ایک جماعت کے نزدیک ثابت شدہ ہے دوسری جماعت اس سے اختلاف کرتی ہے۔ جہاں تک کسی کتاب کا تعلق ہے۔ جس میں حضورؐ کا یہ ثابت شدہ طریق موجود ہو۔ تو کتبِ احادیث میں امام بخاریؒ کے مجموعہ کو سب سے زیادہ صحیح تسلیم کیا جاتا ہے لیکن خود اس مجموعہ کے متعلق بھی (اور تو اور) جماعتِ اسلامی کا عقیدہ یہ ہے کہ انہیں حق حاصل ہے کہ اس کی ایک ایک حدیث کو پرکھا جائے۔ نیز یہ کہ جو روایت کسی ایک شخص کے نزدیک صحیح ہے اسے کوئی حق نہیں کہ وہ دوسرے شخص کو مجبور کرے کہ اسے صحیح تسلیم کرے۔

سنت کے متعلق جو کچھ ہم نے اوپر لکھا ہے۔ وہ ایک واقعہ کا بیان ہے، سمجھنے کی بات یہ ہے کہ کیا سنت کے متعلق اس وقت پوزیشن یہی ہے یا نہیں۔ اگر پوزیشن یہی ہے تو اس کا اظہار نہ انکارِ سنت ہے نہ (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ) توہینِ رسالت یہ تو ہوا آئین کی بنیاد کے دو عناصر میں سے ایک عنصر (سنت) کے متعلق۔ اب دوسرا عنصر لیجئے۔ یعنی کتاب۔ جہاں تک کتاب (قرآن کریم) کا تعلق ہے آپ دنیا کے کسی مسلمان سے پوچھئے وہ بتا دے گا کہ قرآن کریم کس کتاب کا نام ہے۔ دنیا میں قرآن کریم کے کروڑوں نسخے رائج ہیں۔ ان میں (بجز کسی کاتب کی غلطی کے) کہیں ایک حرف کا اختلاف بھی دکھائی نہیں دے گا۔ مسلمانوں کے جتنے فرقے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جسے قرآن کے کتاب اللہ ہونے میں شک و شبہ ہو (شیعہ فرقہ کے متعلق کہا جاتا تھا کہ وہ اسکی صحت میں شبہ کرتے ہیں۔ لیکن ان کے بڑے بڑے مجتہدین کے اقوال موجود ہیں کہ یہ غلط ہے۔ ان کے نزدیک قرآن کریم غیر محرف کتاب ہے) یعنی کتاب اللہ تمام مسلمانوں کے نزدیک متفق علیہ ہے۔ اس لئے جب ہم آئین مملکت کے متعلق کہیں گے کہ اس کی بنیاد کتاب اللہ پر ہے تو اس کا ایک متعین مفہوم سامنے آ جائے گا۔ جس میں کسی ابہام اور شبہ کی گنجائش نہیں ہوگی۔ یہ کہدیا جائے گا کہ جس طرح سنت رسول اللہؐ کی تعبیر میں مختلف فرقوں کو اختلاف ہے۔ اسی طرح قرآن کریم کی تعبیر میں بھی اختلاف ہے۔ لہذا جو دشواری سنت کو آئین کی بنیاد قرار دینے میں بیان کی گئی ہے۔ وہی دشواری قرآن کے متعلق بھی ہے۔ لیکن ہم اس وقت "تعبیر" کے متعلق گفتگو نہیں کر رہے ہیں۔ بلکہ متن (TEXT) کے متعلق بات کر رہے ہیں۔ جب ہم حدیث کے متعلق گفتگو کرتے ہیں تو سب سے پہلا سوال یہ سامنے آتا ہے کہ یہ حدیث رسول اللہؐ کی ہے بھی یا نہیں؟ جسے اس سے اختلاف ہوتا ہے وہ کہتا ہے کہ یہ رسول اللہؐ کا قول نہیں ہو سکتا۔ دوسرا فریق ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ یہ رسول اللہ صلعم کا ارشاد ہے لیکن قرآن کی کسی آیت کے متعلق یہ بحث کبھی نہیں چھڑتی کہ یہ خدا کا ارشاد ہے یا نہیں۔ اس کی ہر آیت اور آیت کا ہر لفظ ارشادِ خداوندی ہوتا ہے۔ اور اسے ایسا ہی سمجھا جاتا ہے۔

نیز کسی حدیث کے متعلق اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ وہ ارشادِ نبوی ہی ہے۔ تو اس کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے کہ حضورؐ کا یہ ارشاد یا عمل بہ حیثیت رسول کے تھا یا آپ نے ذاتی طور پر ایسا فرمایا یا کیا تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ ایسے لوگ بھی ہیں جو حضورؐ کے کسی قول اور عمل میں اس قسم کی تفریق نہیں کرتے لیکن امت میں وہ گروہ بھی تو ہیں جو اس تقسیم و تفریق کو بنیادی سمجھتے ہیں۔ چنانچہ محترم مودودی صاحب نے تو یہاں تک کہدیا ہے کہ جو بات حضورؐ نے ذاتی حیثیت سے کی ہو، اسے سنتِ رسول اللہ صلعم قرار دینا، دین میں تحریف ہے۔ اس کے برعکس قرآن کی کسی آیت کے متعلق یہ سوال پیدا نہیں ہو سکتا کہ اس کی حیثیت "ذاتی ہے یا دینی" اس کی ہر آیت کی حیثیت دینی ہے۔

قرآن اور حدیث (یعنی کتاب اور سنت) کا یہ فرق ایسا واضح ہے جس کے لئے کسی تفصیلی گفتگو کی ضرورت نظر ہی نہیں آتی۔ یعنی

(۱) قرآن کریم کی ہر آیت کے متعلق تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ وہ خدا کا ارشاد ہے۔ اور اسکی حیثیت دینی ہے۔ لیکن

(۲) ہر حدیث کے متعلق یہ صورت نہیں کہ وہ تمام مسلمانوں کے نزدیک متفقہ طور پر ارشادِ رسول اللہؐ ہو۔ یا اس کی حیثیت ہر مسلمان کے نزدیک دینی ہو۔

ان تصریحات کی روشنی میں ہمارا خیال ہے کہ آپ ہم سے متفق ہوں گے کہ اگر آئین پاکستان کے متعلق یہ کہا جائے کہ اس کی بنیاد کتاب اللہ پر ہوگی تو اس کا مفہوم بھی متعین ہوگا۔ اور یہ صورت تمام امت کے نزدیک متفق علیہ بھی ہوگی۔

اب آتا ہے تعبیر کا سوال۔ سو اس کے متعلق اس وقت صورت یہ ہے کہ

(۱) اہلِ حدیث حضرات قرآن کی تعبیر احادیث کی رو سے کرتے ہیں۔

(۲) اہلِ فقہ، قرآن کا مفہوم فقہ کی رُو سے متعین کرتے ہیں۔

(۳) جماعتِ اسلامی کے نزدیک دین کے ہر معاملہ میں سند ان کے امیر مودودی صاحب ہیں۔

چنانچہ جب وہ جہادِ کشمیر کے سلسلہ میں قید ہوئے ہیں تو اس جماعت کے قیّم محترم طفیل محمد صاحب نے ان کے متعلق لکھا تھا کہ

> مولانا اس زمانہ میں اسلام کی ایک مانی ہوئی ہستی تھے۔ اور اسلام کے ہر مسئلہ میں سند تھے اور سند ہیں۔
> (قاصد، کشمیر نمبر۔ بحوالہ الفرقان۔ بابت مئی۔ جون ۱۹۵۵ء۔ صفحہ ۹۱)

ہمارے نزدیک یہ ترتیب الٹی ہے۔ صحیح ترتیب یہ ہونی چاہیئے کہ احادیث، فقہ یا اشخاص کے اقوال و آراء کی تعبیر قرآن کی روشنی میں کی جائے۔ یعنی انہیں قرآن کے تابع رکھا جائے

قرآن کو ان کے تابع نہ رکھا جائے۔ اگر اس ترتیب یعنی

قرآن

حدیث

فقہ

کو سامنے رکھ لیا جائے۔ تو پھر قرآن کی تعبیر میں زیادہ اختلاف کی گنجائش نہیں رہتی۔ قرآن کا متن ہر ایک کے نزدیک متفق علیہ ہوگا۔ اس لئے ہر وہ چیز جو اس کے خلاف جائے گی، اسے چھوڑ دیا جائے گا۔

اب رہی یہ صورت کہ جن امور کے متعلق قرآن نے صرف اصولی احکام دیئے ہیں۔ اور ان کی جزئیات متعین نہیں کیں تو ان کے متعلق ان جزئیات کو سامنے رکھ لیا جائے گا۔ جو اس سے پہلے (احادیث اور فقہ کی رو سے) متعین ہوئی تھیں۔ اگر ہمارے زمانے کے ضروریات اور حالات کے مطابق ان میں کسی رد و بدل کی ضرورت نہ ہوگی تو انہیں علیٰ حالہٖ رہنے دیا جائے گا۔ اگر کسی میں کسی تغیر و تبدل کی ضرورت ہوگی تو باہمی مشاورت سے ایسا کر لیا جائے گا۔ جہاں تک فقہ کا تعلق ہے یہ حضرات (بجز کچھ متشدد قسم کے لوگوں کے) اس قسم کے اجتہادی تغیرات کو ناجائز قرار نہیں دیتے۔ جہاں تک حدیث کا تعلق ہے۔ خود کتب احادیث و آثار میں اس قسم کے متعدد واقعات ملتے ہیں۔ جن میں (مثلاً) حضرت عمرؓ نے رسول اللہ اور خلیفہ اول کے زمانے کے فیصلوں میں بہ اقتضائے حالات تبدیلی کر دی تھی۔ ان نظائر کی روشنی میں ملت کا قرآنی نظام جو علیٰ منہاج نبوت قائم ہو وہ اس کا مجاز قرار پاتا ہے کہ اگر اس کے زمانہ کے حالات اس کے متقاضی ہوں تو وہ سابقہ فیصلوں میں مناسب تبدیلی کر دے۔

ہمارے نزدیک پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام کی یہی صورت ہے۔ اگر اس پوزیشن کو اچھی طرح سے سمجھ لیا گیا تو اس مملکت میں اسلامی نظام کے قیام میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ لیکن اگر قوم کو سطحی جذبات میں الجھا دیا گیا (جیسا کہ اس وقت تک ہوتا رہا ہے) تو آپ دیکھیں گے کہ آئین میں "کتاب و سنت" کے الفاظ لکھ دینے کے باوجود یہاں اسلامی نظام قائم نہیں ہو سکیگا۔ ہوگا صرف یہ کہ ہر فرقہ کے شخصی معاملات جسے (PERSONAL LAW کہا جاتا ہے) اس فرقہ کی فقہ کی رو سے طے کرائے جائیں گے۔ اور امور سلطنت اپنے طور پر سرانجام پاتے رہیں گے (جس طرح انگریزوں کے زمانہ میں ہوتا تھا۔ اور اب تک ہو رہا ہے)

یہاں سے یہ اہم سوال بھی سامنے آتا ہے کہ اسلامی نظام سے مقصود کیا ہے؟ کیا اس سے یہی مقصود ہے کہ شخصی معاملات (نکاح، طلاق وغیرہ) میں اسلامی احکام (فقہ) کی رو سے فیصلے ہوتے جائیں؟ آپ دیکھیں گے کہ ہمارے ارباب مذہب کے ذہن میں اسلامی نظام سے کم و بیش مراد یہی ہے کہ اس میں ان معاملات کے فیصلے شریعت کے مطابق ہوتے ہیں۔ اور جرائم کی شرعی سزائیں دی جاتی ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ایک معاشرہ میں شخصی معاملات کو بھی کافی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ بلکہ ان سے بھی کم درجہ کی جزئیات بھی اہم ہوتی ہیں۔ جیسے (مثلاً) اس وقت ہمارے ہاں "بائیں ہاتھ چلو" کے حکم کو بھی ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اسلامی نظام سے صرف اتنا ہی مقصود ہے؟ کیا اس سے ہمارے معاشرہ میں اس سے زیادہ کوئی تبدیلی نہیں ہوگی؟ اگر اس سے ہمارے معاشرہ میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں ہوگی۔ اور اس کے اثر و نفوذ کا دائرہ عدالتوں کی چار دیواری تک ہی محدود رہے گا۔ تو یہ کوئی ایسی اہم تبدیلی نہیں یہ تو خود ہمارے اس دعوے کی تکذیب ہے کہ اسلام ہماری زندگی کے ہر گوشے اور ہر زاویہ میں ہماری راہ نمائی کرتا ہے۔ اور تمام مسائل حیات کے لئے بے مثل و بے نظیر ضابطہ عطا کرتا ہے۔ اسے یقیناً ایسا کرنا چاہیئے۔ اور اسلامی نظام ایسا کرتا ہے۔ وہ ہماری زندگی کے تمام گوشوں کو محیط ہوتا ہے۔

اس حقیقت کی روشنی میں یہ دیکھئے کہ اس حیات ارضی میں ہماری زندگی کا سب سے اہم شعبہ کونسا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ شعبہ ہماری معاشی زندگی کا ہے۔ اگر آپ کسی معاشرہ کی خرابیوں کا تجزیہ کریں گے تو اس کا کم از کم نوے فیصدی حصہ معاشیات ہی سے متعلق یا متاثر نظر آئے گا۔ کچھ خرابیاں وہ ہوں گی جو افلاس سے پیدا ہوتی ہیں۔ اور کچھ وہ جو دولت کی زیادتی سے ظہور میں آتی ہیں۔ اس تفصیل کو اگر ہم چند الفاظ میں سمٹانا چاہیں تو یہ کہا جائے گا کہ معاشرہ کی بیشتر خرابیوں کا باعث دولت کی غلط تقسیم ہے۔ اور اسلامی نظام اس غلط تقسیم کو مٹا کر معاشرہ کو صحیح خطوط پر لاتا ہے۔ اس معاشرہ کی بنیاد "رب العالمین" کے ابدی اصول پر ہوتی ہے یعنی نوع انسانی کی عالمگیر ربوبیت۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اسلامی نظام میں تمام افراد معاشرہ کی بنیادی ضروریات زندگی کا پورا کرنا، اور ان کی مضمر صلاحیتوں کی کامل نشو و نما کے لئے اسباب و وسائل بہم پہنچانا اس نظام کی اولین ذمہ داری ہوتی ہے۔ اگر کسی نظام میں ایک فرد معاشرہ بھی اپنی ضروریات سے محروم رہ جاتا ہے۔ اور اسے اپنی صلاحیتوں کی نشو و نما کے لئے سامان میسر نہ آسکے۔ تو وہ نظام اسلامی نہیں کہلا سکتا۔ ظاہر ہے کہ یہ نظام اس قدر اہم، وسیع اور عالمگیر ذمہ داریوں سے اسی صورت میں عہدہ برآ ہو سکتا ہے کہ وسائل رزق افراد کی ملکیت کی بجائے نظام کی تحویل میں ہوں۔ اور نظام ان کا قرآنی خطوط کی روشنی میں استعمال کرے اس طرح اس نظام میں دولت کی غلط تقسیم کی رو سے پیدا شدہ خرابیوں کا ازالہ ہی نہیں استیصال ہو جاتا ہے۔ باقی خرابیوں کا بیشتر حصہ جنسیات سے متعلق ہوتا ہے۔ اس کے لئے وہ صحیح تعلیم و تربیت سے ایسا ماحول اور ایسی فضا پیدا کر دیتا ہے۔ جس میں کوئی نگاہ اپنی حد سے آگے نہیں بڑھنے پاتی۔ اور قلب و نظر کی بیباکیاں پابند نشیمن ہو جاتی ہیں۔

کیا آپ چاہتے ہیں کہ پاکستان میں ایسا اسلامی نظام رائج ہو جائے؟ اگر آپ چاہتے ہیں تو سوچئے کہ اب جب کہ آئین پاکستان کی از سر نو تدوین کا مرحلہ درپیش ہے آپ پر کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے؟ اور آپ اس سے عہدہ برآ ہونے کے لئے کیا کر رہے ہیں؟ آپ اپنے آپ کو جھوٹا اطمینان دے کر نہ بیٹھ جائیں۔ اس لئے کہ یہ معاملہ بڑا اہم ہے۔ اور اس کا تعلق آپ سے آگے بڑھ کر آپ کی آنیوالی نسلوں بلکہ پوری نوع انسانی سے ہے۔

سیاست کے کھیل

مغرب کی میکیاولی سیاست (جس کا چلن آج ہر بازار میں ہے) کا مدار اس "اصول" پر ہے کہ مقصد پیش نظر ہمیشہ اپنا فائدہ ہونا چاہیئے۔ اور اس کے حصول کے لئے (جائز و ناجائز) سب کچھ کرنا چاہیئے۔ جس شخص (یا قوم) کی راہ میں اصول پرستی کا خیال تک بھی حائل ہو سکتا ہے۔ اسے اس میدان میں قطعاً قدم نہیں رکھنا چاہیئے۔ "جائز وہ جس سے اپنا مقصد حاصل ہو جائے۔ ناجائز وہ جس سے وہ مقصد حاصل نہ ہو سکے"۔ مغرب میں بالعموم یہ مقصد قومی ہوتا ہے۔ لیکن ہمارے ہاں یہ مقصد بھی انفرادی مفاد ہوتا ہے۔ ہر بطل سیاست کی زبان پر اسلام، قوم، وطن کی بہبودی کا نام اور دل میں اپنے مفاد کے حصول کا جذبہ۔ اس کی تمام تگ و دو کا رخ اسی قبلہ مقصود کی طرف اور اس کی ہر نقل و حرکت اسی محور کے گرد۔

آجکل مجوزہ مجلس آئین ساز کی تشکیل نو اپنے آخری مراحل میں سے گذر رہی ہے (جس وقت یہ پرچہ قارئین کے ہاتھوں میں پہنچے گا۔ انتخاب کے نتائج بھی سامنے آ چکے ہوں گے۔ لیکن جس وقت یہ سطور سپرد قلم ہو رہی ہیں اس وقت ابھی انتخاب میں تین دن باقی ہیں) یہ ایک ایسی مجلس کے اراکین کا انتخاب ہے جس نے ملک کے لئے آئین مرتب کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ اصول پرستی کی رو سے اس مجلس کے لئے ایسے اراکین کا انتخاب ہونا چاہیئے جو ترتیب آئین کے اہل ہوں۔ لیکن حرام جو ہمارے ارباب سیاست میں سے کسی کے پیش نظر بھی یہ مقصد ہو۔ ان میں سے ہر ایک کی دوڑ دھوپ اس مقصد کے لئے ہے کہ وہ خود اس اسمبلی کے لئے منتخب ہو جائے اور (جب اس کا اطمینان ہو جائے تو) اس کی پارٹی اکثریت میں آ جائے۔ چونکہ (بد قسمتی سے) اس اسمبلی نے مجلس مقننہ کے فرائض بھی سرانجام دینے ہیں۔ اور حکومت اس پارٹی کی بنا کرتی ہے جس کی مقننہ میں اکثریت ہو، اس لئے اسمبلی میں اپنی اپنی پارٹی کو محکم بنانے کا خیال دیوانگی کی حد تک پہنچ رہا ہے۔ اور اس کے لئے وہ کچھ کیا جا رہا ہے جس کے تصور سے روح دیانت کی پیشانی عرق آلود ہو جاتی ہے۔ اسی مقصد کے لئے ہمارے وزیر اعظم مسٹر محمد علی نے مشرقی پاکستان کی حکومت فضل الحق صاحب کے سپرد کر دی۔ وہی فضل الحق صاحب جنہیں انہی محمد علی صاحب نے سال گذشتہ پاکستان کا غدار قرار دیا تھا۔ ادھر سے اطمینان کے بعد انہوں نے اپنے لئے مسلم لیگ کی طرف سے ٹکٹ لے لیا۔ اور اس طرح مطمئن ہو گئے کہ بنگال کی دو پارٹیاں ان کے ساتھ ہوں گی لیکن ان کے اس اطمینان کا سانس ابھی پھیپھڑے تک بھی پہنچنے نہ پایا تھا کہ معلوم ہوا کہ مسلم لیگ کی نشست کے لئے فضل الرحمٰن صاحب مقابلہ کر رہے ہیں (یادش بخیر خواجہ ناظم الدین وزارت کے کامرس منسٹر فضل الرحمٰن صاحب) یعنی آل پاکستان مسلم لیگ کے صدر اعظم کی خود اپنی پارٹی میں یہ پوزیشن ہے کہ وہ انہیں بھی ٹکٹ دیتی ہے۔ اور ان کے مقابلہ میں ایک دوسرا امیدوار بھی کھڑا کر دیتی ہے۔ کہتے ہیں کہ اس ناگہانی آفت نے قصر وزارت عظمیٰ کے در و دیوار کو ہلا دیا۔ اور محترم محمد علی صاحب اڑ کر کراچی سے ڈھاکہ جا پہنچے۔ (اس دن عید اور ہفتہ کی درمیانی شب کو، پاکستان انٹرنیشنل

کے جہاز کے ڈھاکہ جانے کی باری نہیں تھی۔ اس لئے وہ ایک اور کمپنی کے جہاز میں کلکتہ تک گئے۔ اور کلکتہ سے جہاز تبدیل کر کے ڈھاکہ پہنچے) اب دیکھئے کہ فضل الرحمن صاحب کا کیا حشر ہوتا ہے۔

لیکن ادھر سے مطمئن ہو جانے کے بعد بھی ہمارے محترم وزیر اعظم صاحب کے نصیب میں اطمینان نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ یہ خبر بھی فضا میں گشت لگا رہی ہے کہ مسٹر فضل الحق صاحب خود وزیر اعظم بننے کی فکر میں ہیں۔ چنانچہ وہ مجلس آئین ساز کی رکنیت کے لئے امیدوار ہیں اور ان کا انتخاب یقینی ہے۔ اس انتخاب کے بعد وہ مشرقی پاکستان کے سب سے بڑے گروپ کے قائد ہونگے ظاہر ہے کہ مشرقی پاکستان کے ہندو بھی انکے ساتھ ہوں گے اگر مغربی پاکستان کا تھوڑا سا حصہ بھی انھوں نے اپنے ساتھ ملا لیا تو ان کا وزیر اعظم بن جانا دھرا رکھا ہے۔

کس قدر عبرت انگیز ہوگا وہ منظر جب محمد علی صاحب خود اپنے بنائے ہوئے "خداؤں" کے ہاتھوں اپنی موہومہ جنت سے اس بری طرح نکالے جائیں گے۔ اور خدائے حقیقی کے قانون مکافات عمل کی بے صوت صدا پکار پکار کر کہہ رہی ہوگی کہ ھذا اجزاء بما کنتم تعملون۔ یہ تمہارے اپنے ہی کئے کا پھل ہے۔ اس لئے ذق انک انت العزیز الکریم۔ اور روح مملکت پاکستان سر جھکائے اپنے مقدر پر خون کے آنسو بہا رہی ہوگی۔ اور سسکیاں بھر بھر کر کہہ رہی ہوگی کہ بای ذنب قتلت! میرے ساتھ یہ کس جرم کی پاداش میں ہو رہا ہے!

امریکی امداد

معاصر "ڈان" نے ۱۰ر جون کی اشاعت میں "امریکہ، پاکستان اور جمہوریت" کے عنوان سے جو مقالہ افتتاحیہ چھاپا ہے وہ بوجوہ قابل مذمت ہے اگر اس نے یہ سب کچھ معصومانہ طور پر نہیں لکھا تو غایت درجہ کی جہالت کا ثبوت دیا ہے۔ مقالہ پڑھنے کے بعد یہ کہنا پڑتا ہے کہ معاصر موصوف امریکہ، پاکستان، اور جمہوریت میں سے کسی ایک کے مزاج یا روح کو نہیں سمجھ سکا۔ امریکی امداد کی مزعومہ سست رفتاری کو مدار بحث بنا کر مدیر "ڈان" نے سارا زور قلم اس پر صرف کیا ہے کہ پاکستان میں جمہوریت کا جنازہ نکل چکا ہے۔ اور ایسا تن بے جان میں جان رفتہ لانے کی واحد صورت یہ ہے کہ عنان اقتدار پھر سے اس طائفہ مردود کے سپرد کر دی جائے جسے گورنر جنرل نے انتہائی بیش حسن تدبیر اور کمال جرات کا مظاہرہ کرتے ہوئے معزول و مشلول کر دیا تھا۔ جہاں تک کسی گروہ کی حمایت کا تعلق ہے معاصر کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی سمجھ اور پسند کے مطابق اپنے ممدوح چنے۔ اس حمایت کے ساتھ اسے مخالف گروہ کی مذمت کا بھی حق حاصل ہے ملے یہ بھی رعایت دی جا سکتی ہے کہ وہ حمایت و مذمت میں ایک حد تک مبالغہ سے کام لے جمہوریت میں کم از کم عہد حاضر کی جمہوریت میں یہ قابل فہم ہے۔ لیکن جمہوریت کا یہ مفہوم کبھی نہیں ہو سکتا کہ مدح و قدح میں ایسا غلو برتا جائے کہ اس سے ملکی مفاد تک خطرہ میں پڑ جائے۔ ہمیں افسوس ہے کہ معاصر نے ایسے ہی غلو سے کام لیا ہے۔ اور ایسا زہریلا اور شر انگیز لیڈنگ آرٹیکل لکھا ہے جسے پاکستان کے خلاف استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اور کیا جائے گا۔ تعجب ہے کہ یہ اعتراف کرنے کے باوجود کہ دیگر ممالک کے نمائندے ہمارے ہاں موجود ہیں اور وہ کان لگا کر اور آنکھیں کھول کر بیٹھے ہیں اتنی احتیاط بھی نہیں برتی کہ بلا سوچے سمجھے ایسی بات نہ کہہ دی جائے، جو خلاف واقعہ بھی ہو۔ اور ملک کے خلاف بھی استعمال کی جا سکے۔

اس طویل لیکن بے مغز مقالہ کو دیکھ کر صاف پتہ چلتا ہے کہ مدیر اخبار نے امریکی امداد کو بہانہ بنا کر جلے دل کے پھپھولے پھوڑنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے بزعم خود یہ ثابت کرنے کے بعد کہ پاکستان میں جمہوریت دم توڑ چکی ہے۔ یہ نتیجہ نکالا ہے کہ امریکہ یہ دیکھ کر ٹھنڈا ہو گیا ہے۔ اور اس نے امداد کی رفتار مدھم کر دی ہے۔ یہ بیان صریحاً خلاف حقیقت لہٰذا غلط ہے اول تو یہ مفروضہ بے بنیاد ہے کہ پاکستان میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ جمہوریت کے منافی ہے۔ جمہوریت کا اصل الاصول یہ ہے کہ ارباب حکومت باقاعدہ منتخب کئے جائیں اور وہ بدلے بھی جا سکیں اگر کوئی فرد یا گروہ منتخب ہونے کے باوجود ناقابل تبدیل ہو جائے تو یہ تقاضائے جمہوریت کے خلاف ہوگا۔ مثلاً سابقہ مجلس دستور ساز نے اپنے آپ کو ناقابل تبدیل بنانا چاہا تھا۔ اگر واقعی ایسا ہو جاتا تو دستور یہ کو محض اس بناء پر جمہوری کہنا غلط ہو جاتا کہ وہ ایک سے زیادہ افراد پر مشتمل ہے یا وہ کسی زمانہ میں منتخب ہو کر آئے تھے۔ اسی طرح ۲۴ر اکتوبر کو گورنر جنرل نے جو اقدام کیا وہ فیڈرل کورٹ کے فیصلے کے مطابق بالکل آئینی تھا۔ اس اقدام کے بعد گورنر جنرل کی طرف سے یہی کوشش ہوتی رہی کہ کسی طرح آئین مرتب ہو جائے اور ملک کو نئے انتخابات کا موقع مل جائے۔ اس عمل کو معاصر موصوف کے ممدوحین نے نتیجہ خیز نہیں ہونے دیا اور اب بھی ان کی مشئوم کوشش یہی ہے کہ اسے معطل یا واژگوں کر دیا جائے۔ گویا نہ مجرد اقدام خلاف جمہوریت ہے اور نہ اس اقدام سے پیدا کیا جانے والا معلوم نتیجہ۔ بعض حلقوں میں انتخابات کی دھاندلی کو مدار بنا کر سرے سے سارے عمل ہی کو غیر جمہوری کہا جا رہا ہے۔ خود "ڈان" اسی غلطی کا شکار ہے۔ یہ استنباط بھی بے بنیاد ہے۔ اگر ایسے لوگ موجود ہیں جو انتخابات کو ذاتی استحکام کا ذریعہ بناتے ہیں۔ اور شخصی یا حکومتی اثر کو اپنے حق میں استعمال کرتے ہیں تو اس سے جمہوری عمل غلط نہیں قرار دیا جا سکتا۔ بلکہ یہ سوال سامنے آتا ہے کہ ان حرکات شنیعہ کا تدارک کیسے کیا جائے؟ اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ سرے سے جمہوریت کا وجود ہی باقی نہیں۔

جب یہ مفروضہ غلط ہے تو اس پر اٹھائی ہوئی عمارت یقیناً غلط ہوگی۔ لیکن ہمارے معاصر نے یہاں دوسری غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔ اس کے خیال میں امریکہ نے پاکستان کو مدد دینے کا فیصلہ محض اس لئے کیا تھا کہ پاکستان جمہوریت کا داعی تھا۔ عالمی سیاست اور امریکی حکمت عملی کا کوئی مبصر اس کی تصدیق نہیں کرے گا۔ آئے روز دیکھا یہ جاتا ہے کہ قوموں کے اتحاد مفادات مشترک کی بناء پر دفاعی نقطہ نظر سے طے پاتے ہیں شاید کسی ایک بھی ایسے اتحاد کا نام نہ لیا جا سکے جو خالصتاً نظریاتی بناء پر معرض وجود میں آیا ہو۔ جہاں تک امریکہ کا تعلق ہے۔ وہ ایسے ملکوں کو اب بھی مدد دے رہا ہے جہاں جمہوریت کی بجائے فوجی حکومتیں قائم ہیں۔ لہٰذا یہ کہنا صحیح نہیں کہ اگر امریکی امداد کی مقدار اور رفتار کم ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ پاکستان میں جمہوریت نہیں اور امریکہ محض جمہوریت کی بناء پر دوسرے ممالک کی امداد کرتا ہے۔

امریکی امداد سے متعلق حقیقت حال کیا ہے۔ اس کا پتہ وزیر دفاع جنرل محمد ایوب خاں کے تازہ بیان سے چلتا ہے آپ نے ۱۹ر جون کو غالباً ڈان کے مقالے کے جواب میں بڑے حتم و یقین سے کہا کہ سست رفتاری اور کم مقداری کی معقول وجہ ہو اور اس میں مطلقاً صداقت نہیں کہ سیاسی یا دیگر وجوہ کی بناء پر امریکی جوش امداد ٹھنڈا پڑ گیا ہے۔ یہ بیان بڑا بروقت ہے۔ اور ہمیں یقین ہے کہ اس سے وہ شکوک و شبہات دور ہو جائیں گے جو اس ضمن میں پیدا کر دیئے گئے ہیں، یا ہو گئے ہیں۔ ہم اس موقعہ پر وزیر اعظم کے ایک بیان کا حوالہ دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ آپ نے ۔ ارجون کو لاہور میں ایک اخباری نمائندے کے سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ امریکی امداد سست معلوم ہوتی ہے۔ اور ان کے نزدیک وہ تیز تر ہونی چاہیئے اور ہو سکتی ہے۔ اس مختصر سے بیان سے ایک ہی اثر مرتب ہو سکتا تھا۔ اور وہی ہوا۔ کہ خود وزیر اعظم کو شکایت ہے کہ امریکہ امداد دینے میں ڈھیل برت رہا ہے۔ اگر وزیر اعظم محتاط بیان دیتے تو کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہوتی اور غیر محتاط اور بدباطن عناصر کو وہ کچھ کہنے کا موقعہ نہ ملتا جو "ڈان" نے کہا۔ پچھلے دنوں وزیر اعظم صاحب نے یہ شکایت کی کہ عام طور پر بھی انھیں ہی تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ اگر کسی اخبار نے ان پر بلا وجہ تنقید کی ہے تو ہمیں اس کا دلی رنج ہے۔ لیکن کیا یہ مناسب نہیں کہ بیان دینے سے پہلے یہ اچھی طرح سوچ لیا جائے کہ حقیقت کیا ہے اور اسے کس طریق سے ملک کے سامنے پیش کرنا چاہیئے؟ اس سلسلہ میں ذرا سی احتیاط بعد کی بہت سی ناگوار و تلخ بحثوں کی روک تھام کر سکتی ہے؟

انڈیا آفس لائبریری

انڈیا آفس لائبریری کا مسئلہ پچھلے مہینے سے خصوصی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ مئی کے تیسرے ہفتے میں اس سلسلہ میں پاکستان اور ہندوستان کے وزرائے تعلیم کے مابین مذاکرات ہوئے تھے ان مذاکرات میں کیا طے ہوا، اس کے متعلق تفصیل سے کچھ نہیں بتایا گیا۔ ۲۰ر مئی کو جو اعلامیہ دہلی سے شائع ہوا اس میں کہا گیا تھا کہ چونکہ لائبریری دونوں ممالک کی ملکیت ہے اس لئے وہی اسکے مستقبل کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔ اعلامیہ میں یہ اشارہ بھی موجود تھا کہ بعض امور سے متعلق دونوں وزیروں میں سمجھوتہ ہو گیا ہے لیکن وہ اگست میں مزید گفتگو کریں گے۔

اس کے بعد وزیر تعلیم ہند مولانا ابوالکلام آزاد نے ۲۸ر مئی کو یورپ جاتے ہوئے کراچی میں ایک ملاقات میں کہا کہ تقسیم سے پہلے لائبریری کی مالک حکومت ہند تھی اور تقسیم کے بعد حق ملکیت حکومت ہائے ہندوستان اور پاکستان

کے نام منتقل ہوگیا ہے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ پاکستان اور ہندوستان کے مابین اس لائبریری کی تقسیم کا اصول تسلیم کرلیا گیا ہے اور تصاویر وغیرہ جیسے جدید طریقوں کو استعمال کرکے ایسا انتظام کیا جائے گا کہ لائبریری مکمل طور پر دونوں ملک کے کام آسکے۔ مولٰنا نے یہ بھی فرمایا کہ ۱۹۴۹ء میں انھوں نے اس سلسلہ میں برطانیہ کے دولت مشترکہ کے سکریٹری سے بات بھی کرلی تھی۔

دہلی کے اعلامیہ اور مولٰنا کے بیان سے دو امور واضح ہوجاتے ہیں۔ ایک یہ کہ انڈیا آفس لائبریری پاکستان اور ہندوستان کی ملکیت ہے اور دوسرے یہ کہ لائبریری کی تقسیم اس طرح سے کی جائے گی کہ دونوں ممالک پوری طرح اس سے استفادہ کر سکیں گے۔ یہاں تک تو بات صاف تھی لیکن اب برطانیہ کے دولت مشترکہ کے سکریٹری نے ۱۰رجون کو جو بیان پارلیمان میں دیا ہے اس سے صورت حال بدل جاتی ہے انھوں نے غیر مبہم طور پر کہدیا ہے کہ برطانوی حکومت لائبریری کو علی حالہ لندن میں رکھنا چاہتی ہے۔ انھوں نے حکومت کے اس خیال ہی کا اظہار نہیں کیا بلکہ اسے صحیح بھی قرار دیا۔ انھوں نے البتہ اس پر رضامندی کا اظہار کیا کہ اگر اس کے انتظام اور استعمال وغیرہ سے متعلق حکومت ہائے پاکستان اور ہندوستان کوئی تجویز پیش کریں گی تو اس پر مناسب غور کیا جائے گا۔ اس بیان کی صورت یہ ہوتی ہے کہ لائبریری پاکستان اور ہندوستان کی مشترکہ ملکیت نہیں بلکہ برطانیہ کی ملکیت ہے اور وہ اسے اپنے ہاں رکھنے پر مصر ہے۔ اس سلسلہ میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ ہندوستان کے اخبارات وغیرہ شدومد سے مطالبہ کررہے ہیں کہ لائبریری کو لندن سے نئی دہلی منتقل کردیا جائے اور پاکستان کو اس کے استعمال کی آسانیاں دی جائیں۔ گویا پاکستان کے نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے تو پہلا مرحلہ تو یہ ہے کہ برطانوی حکومت کو منوایا جائے کہ وہ لائبریری کو لندن سے منتقل ہونے دے اور دوسرا یہ کہ ہندوستان یہ اصرار چھوڑ دے کہ اس کا ذخیرہ سارے کا سارا اس کی تحویل میں رہے۔ یہ دونوں صورتیں ہمارے نزدیک اس لئے قابل قبول نہیں کہ اس طرح لائبریری کی افادیت بمنزلہ صفر کے ہوجاتی ہے۔ پاکستان میں بدقسمتی سے کوئی قابل ذکر لائبریری نہیں۔ محض یہی نہیں بلکہ ایک اعلیٰ علمی لائبریری کا قیام محال نہیں تو بہت دشوار ضرور ہے اس لئے پاکستان کسی طور اس بے بہا ذخیرے سے محروم نہیں رہ سکتا جو انڈیا آفس لائبریری میں موجود ہے اندریں حالات لائبریری مذکور کی منصفانہ تقسیم ایک سنگین علمی مسئلہ ہے جسے جلد از جلد طے کرنا چاہئے۔ مذاکرات کی موجودہ رفتار سے ایسے پتہ چلتا ہے کہ حکومت پاکستان اس اہم معاملہ کو پوری توجہ کا مستحق نہیں سمجھ رہی۔ اگر غفلت شعاری کا یہی عالم رہا تو اقبال کے الفاظ میں یہ موتی علم و فن کے اور کتابیں اپنے آبا کی ہمارے دلوں کو دائماً سی پارہ بنادیں گی اور صحیح علمی تحریک کے پیدا ہونے اور فروغ پانے کے امکانات ختم ہوجائیں گے لہٰذا ہم حکومت کو استدعا کرتے ہیں کہ وہ ہشیاری سے کام لے اور قوم کو صاف صاف بتائے کہ اس سلسلہ میں اب تک کیا کچھ ہوچکا ہے۔ اور آئندہ حصول مقصد کا کیا ذریعہ ہوگا؟

پانی کی تقسیم

ہمارے معاشرے کی بنیادی خرابی یہ ہے کہ اس میں ضروریات زندگی کی تقسیم بڑی غیر مساوی اور نامنصفانہ ہے۔ اور تو اور پانی جیسی ضروری شے بھی کسی قاعدے قانون کے مطابق تقسیم نہیں ہوتی حالانکہ ایک مرکزی نظام کے تحت ہونے کی بدولت ایسا کرنا آسان اور قابل عمل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی تقسیم کرنیوالے اور جن کیلئے یہ تقسیم کی جاتی ہے، سبھی ان ناہمواریوں کو ایسا ناگزیر سمجھے ہیں کہ ان کے دور کرنے کی ضرورت کا احساس بھی کم سے کم کیا جاتا ہے۔ کراچی شہر کے پانی کا مسئلہ عجیب ڈھب سے دوسرا ہوا ہے۔ تقسیم ہند کے بعد اسکی آبادی یک لخت کئی گنا ہوگئی لیکن ذخائر آب کم و بیش وہی رہے۔ گو گذشتہ آٹھ سال میں پانی کی مقدار میں اچھا خاصا اضافہ کیا جاچکا ہے لیکن ابھی مطلوبہ مقدار کا مہیا کرنا دور کی بات ہے۔ ابھی پچھلے دنوں کراچی جائنٹ واٹر بورڈ کے صدر نے یہ اعلان کیا تھا کہ ۱۹۵۸ء سے پہلے اس مقدار کی توقع عبث ہے۔ اب تک یہ مطلوبہ مقدار کیوں مہیا نہیں ہوسکی یہ بحث تو علیحدہ ہے، لیکن تعجب ہے کہ اب تک یہ بھی نہ سوچا گیا کہ موجودہ ذخیرہ آب کو اس طریق سے استعمال کیا جائے کہ اس کا زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جاسکے۔ اب تک شہر میں صورت حال یہ تھی کہ ایک طرف ایسے علاقے ہیں جہاں اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے پانی چلتا رہتا ہو وہاں دوسری طرف ایسے علاقے بھی ہیں جہاں پانی ملتا ہی نہیں۔ ان محروم آب علاقوں کا دارومدار کارپوریشن کی آبی گاڑیوں پر ہے۔ لیکن یہ ذریعہ آب رسانی پوری طرح قابل اعتماد ہے نہ اس کو ضرورت ہی پوری ہوسکتی ہے۔ چنانچہ ایسے علاقوں میں رہنے والوں کو طرح طرح کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اور عصر کے عہد جاہلیت کی طرح پانی پینے پلانے پر جھگڑے آئے روز ہوتے رہتے ہیں۔

ہاں اب واٹر بورڈ اور کارپوریشن نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ پانی کی تقسیم مساویانہ طریق سے کی جائے اور شہر کے تمام حصوں میں یکساں طور پر آٹھ گھنٹے پانی مہیا کیا جائے۔ اندازہ یہ ہے کہ اس طرح کوئی پندرہ لاکھ گیلن پانی ہر روز بچ جائیگا اور اسے ان علاقوں میں پہنچایا جاسکیگا جہاں پانی کا کوئی خاطر خواہ انتظام نہیں۔ یہ تجویز بدیہی طور پر مفید ہے اور ہمیں خوشی ہوگی اگر واٹر بورڈ اور کارپوریشن مل کر اسے کامیاب بنائیں۔ لیکن ہم اس سلسلہ میں یہ گذارش کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ خداوندان آب نے اب تک حسن انتظام کوئی ایسا مظاہرہ نہیں کیا جس سے ان سے یہ حسن ظن قائم کیا جاسکے وہ اس منصوبہ کو بطریق احسن قابل عمل بنائیں گے۔ مثلاً کارپوریشن جہاں جہاں گاڑیوں کے ذریعہ پانی پہنچاتی ہے وہاں سے بے تدبیری، بدانتظامی اور فقدان ہمدردی کی شکایات اکثر و بیشتر موصول ہوتی رہتی ہیں۔ خود ارباب بلدیہ نے کئی مرتبہ اعتراف کیا ہے کہ ان کے پاس ایسا انتظام نہیں کہ وہ محروم آب علاقوں میں زیادہ پانی پہنچا سکیں۔ ان حالات میں بجا طور پر یہ خدشہ ہوسکتا ہے کہ جن علاقوں میں اب زیادہ پانی ہے ان کا پانی تو کم ہوجائیگا لیکن جنھیں زیادہ پانی کی ضرورت ہے ان کے لئے اصلاح حال کی خاطر خواہ صورت پیدا نہیں ہوگی

اگر ایسا ہے تو ہم بلدیہ اور بورڈ سے درخواست کریں گے کہ وہ اپنی بدانتظامی سے ان لوگوں کو پریشان نہ کریں جو اتفاق سے ایسے علاقوں میں رہ رہے ہیں جہاں پانی کی مقدار مقابلتاً زیادہ ہے۔ لیکن اگر واقعی ان کے پاس ایسا انتظام ہے کہ وہ اس طریق تقسیم سے بچایا ہوا پانی قلت کے علاقوں میں پہنچا سکیں گے تو وہ نہ محض ان علاقوں کو مشکور و ممنون بنالیں گے بلکہ ان کی ہمدردی حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہوجائیں گے جن کی پانی کی سپلائی کم دی جائے گی۔ اگر ایسا نہ ہوا تو شہر میں بے اطمینانی پھیل جائے گی اور خواہ مخواہ کا ایک فتنہ کھڑا ہوجائے گا۔ ہم اہل شہر سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ بلدیہ اور بورڈ کو اس تجربہ کا پورا موقع دیں اور ضرورت سے زائد پانی سے محرومی کو خندہ پیشانی سے برداشت کریں۔ اس میں خفیف سی پابندی تو ضرور لگے گی۔ لیکن انہی کے کم خوش قسمت بلکہ بدقسمت بھائی جو اس وقت پانی کے ایک ایک قطرے کو ترستے ہیں قدرے اطمینان سے وقت گزار سکیں گے۔

نیکووال

۱۰رجون کو سرکاری ذرائع سے ہندوستانی اخبارات نے نیکووال کے حادثے سے متعلق جو کچھ شائع کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان پوری ڈھٹائی سے پروپیگنڈہ کے زور سے حقائق کا منہ چڑانے پر تلا ہوا ہے۔ اس میں ساری ذمہ داری پاکستان پر ڈال کر کہا گیا ہے کہ حکومت ہند نے حکومت پاکستان سے ہرجانہ طلب کر رکھا ہے نیکووال میں جو کچھ ہوا، اس کی تفتیش اقوام متحدہ کے مبصروں تک نے کرلی ہے۔ ان کی رپورٹ یہ ہے کہ معاہدہ کے مطابق نیکووال کے علاقے میں ہندوستانی داخل نہیں ہوسکتے تھے۔ اس کے باوجود ایک دن انھوں نے آکر خالی زمین پر ہل چلانا شروع کردیا۔ نیکووال کے لوگوں نے اس کے خلاف احتجاج کیا۔ اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک پاکستانی لڑکی ماری گئی۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستانی نہ صرف پاکستانی علاقے میں ناجائز طور پر داخل ہوئے بلکہ ایک پاکستانی لڑکی کو قتل کرنے کے بھی مرتکب ہوئے۔ یہ کچھ ہوچکا تو پاکستانی سرحدی پولیس موقعہ پر پہنچی اور ان کے اور ہندوستانی سپاہیوں کے درمیان تصادم ہوا جس میں بارہ ہندوستانی کام آئے۔ اور تین پاکستانی شہید ہوئے۔ اقوام متحدہ کے مبصروں کی رپورٹ میں ایسا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ پاکستانی سرحدی پولیس نے پہل یا زیادتی کی۔ اس رپورٹ کے باوجود ہندوستان کی طرف سے کہا جارہا ہے کہ پاکستان نے پہل کی۔ چنانچہ اس بنا پر ہرجانہ کا بھی مطالبہ کیا گیا ہے۔

ہمیں افسوس ہے کہ حکومت پاکستان نے اس قضیہ میں اپنے فرض کو صحیح طریق سے ادا نہیں کیا۔ حادثے کے فوراً بعد جب ہمارے وزیر اعظم دہلی گئے تو پاکستانی نقطہ نگاہ پیش کرنے کی بجائے آپ نے مودبانہ اور معذرت خواہانہ انداز میں یہ کہنے میں بھی باک محسوس نہ کیا کہ اگر پاکستانیوں کا جرم ہوا تو وہ انھیں قرار واقعی سزا دیں گے۔ اسے ہندوستانی پریس نے خوب اچھالا اور

(باقی صفحہ ۱۰ پر)

تاریخی شواہد

(۲۰)

یہ ہے اس قومِ عاد کی عبرت انگیز داستان جس کے متعلق کہا کہ جاؤ دیکھو۔ ان کے اجڑے ہوئے مساکن میں تمہارے لئے کون کون سے سامان بصیرت مدفون ہیں۔؟

وَعَادًا وَّ ثَمُوْدَاْ وَقَدْ تَّبَیَّنَ لَکُمْ مِّنْ مَّسٰکِنِهِمْ قف (۲۹/۳۸)

اور (دیکھو، پھر ایسا ہوا کہ تمہارے پروردگار نے) عاد اور ثمود کو ہلاک کیا۔ اور یہ بات (یعنی ان کی تباہی) تمہارے لئے ان کی آبادیوں سے ظاہر ہو گئی ہے۔

جوں جوں زمانہ آگے بڑھ رہا ہے۔ اثری انکشافات ان زمین دوز بستیوں سے نقاب اٹھاتے چلے جا رہے ہیں۔ جن کے نیچے سے مٹی ہوئی عظمتوں اور لٹی ہوئی سلطنتوں کے نقوش یوں نمودار ہو رہے ہیں جیسے کوئی آنکھیں ملتا ہوا نیند سے اٹھ بیٹھے۔ جس قوم کے سینے میں دل اور نگاہوں میں بصیرت ہے۔ اس کے لئے ان ویرانوں کی ٹھیکریاں عروج و زوالِ امم کی ہزاروں خاموش داستانیں اپنے اندر رکھتی ہیں فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ کیا کوئی ہے جو ان سے عبرت حاصل کرے؟

حضرت ہودؑ کے بعد ترتیب کے لحاظ سے حضرت صالحؑ (قوم ثمود) کا تذکرہ آنا چاہیئے۔ لیکن قرآن کریم نے ان دونوں کے درمیان ایک ایسی ہستی کا ذکر کیا ہے جو اگرچہ حضرات انبیاء کرامؑ کے زمرہ میں شامل نہیں۔ لیکن اس کی تعلیم کو نمایاں حیثیت دی گئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت ہودؑ مع اپنے متبعین کے، اپنی برباد ہونے والی قوم کے دیار و مساکن سے نکل کر حجاز کی جانب آگئے تھے اور اسی علاقہ میں ان کی نسل (عاد ثانیہ) بڑھی اور پھیلی۔ ان میں ایک نیک سیرت حکمران گذرا ہے جسے لقمان کہا جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکمران حضرت ہودؑ کی شریعت کا متبع تھا۔ اور اپنی حکمت و دانائی کے لحاظ سے حکیم لقمان کے نام سے مشہور تھا۔ ایک قدیمی کتبہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے فیصلے ایک کتاب میں لکھے جاتے تھے۔ یہی لقمان ہیں جن کا ذکر قرآن کریم نے خصوصیت سے کیا ہے۔ اس ذکر سے بتانا یہ مقصود ہے کہ جب انسانی عقل و بصیرت وحی کی روشنی میں فیصلے کرتی ہے تو وہ فیصلے کس قدر صادق، واضح اور انسان کو سلامتی کے راستوں پر چلانے والے ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کا نظام ہی یہ ہے کہ وحی کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں اپنے معاملات کے فیصلے عقل و فکر کی رو سے کئے جائیں۔ اقبالؒ کے الفاظ میں عقل و وحی، علم و عشق ذکر و فکر، خبر و نظر، خرد و جنوں کا یہی وہ حسین امتزاج ہے۔ جو اسلام کا طرۂ امتیاز ہے۔ قرآن نے اسی مقصد کے پیش نظر لقمان کی حکمت آموز باتوں کا ذکر کیا ہے۔ سورۂ لقمان میں ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَیْنَا لُقْمٰنَ الْحِکْمَةَ اَنِ اشْکُرْ لِلّٰهِ ط وَمَنْ یَّشْکُرْ فَاِنَّمَا یَشْکُرُ لِنَفْسِهٖ ج وَمَنْ کَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ حَمِیْدٌ ۝ (۳۱/۱۲)

اور (دیکھو) ہم نے لقمان کو حکمت و دانائی عطا فرمائی تھی۔ اور کہا تھا کہ وہ (اس) حکمت کی روشنی میں مصروف عمل رہے۔ تاکہ اس کی مساعی بھرپور نتائج کی حامل ہوں۔ یاد رکھو! جو اس طرح کوشش کرتا ہے۔ اس کی کوشش کے نتائج خود اس کی اپنی ذات کے لئے ہوتے ہیں۔ ورنہ اللہ ان باتوں سے بے نیاز اور ستودہ صفات ہے۔

اس مقام پر اتنا واضح کر دینا ضروری ہے کہ قرآن نے حضرت انبیاء کرامؑ کے ضمن میں بھی فرمایا ہے کہ انہیں کتاب و حکمت عطا کی گئی تھی۔ اور حکمت بھی اسی طرح منزل من اللہ تھی جس طرح کتاب۔ وہاں کتاب سے ضابطۂ خداوندی مراد ہوتا ہے۔ اور حکمت سے وہ غایت و مقصود جس تک وہ قوانین پہنچاتے ہیں۔ یہاں کہا گیا ہے کہ لقمان کو حکمت دی گئی تھی۔ اس اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ اس حکمت سے مراد انسانی فراست نہیں بلکہ وحی الٰہی ہے۔ لیکن چونکہ قرآن میں کسی جگہ لقمان کا نام انبیاء کے زمرہ میں نہیں آیا۔ اس لئے خیال اس طرف جاتا ہے کہ اس سے مراد انسانی فراست ہی ہے وہ وحی نہیں جو انبیاء سے مخصوص ہوتی ہے

اس سے آگے ہے۔

وَاِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَهُوَ یَعِظُهٗ یٰبُنَیَّ لَا تُشْرِکْ بِاللّٰهِ ط اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ ۝ (۳۱/۱۳)

اور (یاد کرو) جب لقمان نے اپنے بیٹے سے اُسے نصیحت کرتے ہوئے کہا تھا کہ برخوردار! خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا۔ بلاشبہ شرک کرنا بڑا ہی ظلم ہے۔

شرک کو ظلم عظیم کہہ کر ایک عظیم الشان حقیقت کو دو لفظوں میں سمو دیا گیا ہے۔ ظلم کے معنی ہیں کسی چیز کو غیر محل رکھنا۔ اس کا غلط استعمال کرنا۔ کائنات کی ہر شے اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے۔ اس لئے شرک ظلم عظیم ہے۔ لہٰذا اس سے بڑھ کر بے محل بات اور کونسی ہو سکتی ہے کہ انسان مخلوق کو خالق کا مقام دیدے (تشریح اپنے مقام پر آئے گی)، اس کے بعد اس علام الغیوب کے متعلق فرمایا۔

یٰبُنَیَّ اِنَّهَآ اِنْ تَکُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَکُنْ فِیْ صَخْرَةٍ اَوْ فِی السَّمٰوٰتِ اَوْ فِی الْاَرْضِ یَاْتِ بِهَا اللّٰهُ ط اِنَّ اللّٰهَ لَطِیْفٌ خَبِیْرٌ ۝ (۳۱/۱۶)

(اور دیکھو، لقمان نے اپنے بیٹے سے کہا) برخوردار! (یاد رکھو) بلاشبہ اعمال (کسی کے بھی ہوں) اگر ایک رائی کے دانے کے برابر بھی ہوں۔ پھر وہ کسی پتھر کی چٹان میں (رکھ دیئے گئے) ہوں یا آسمانوں کے اندر یا زمین کے اندر ہوں خدا ان کے نتائج کو ضرور مرتب کرے گا۔ بلاشبہ خدا بڑا ہی باریک بین اور خبردار ہے۔

دیکھئے! اس سے مخلوق اور خالق کا فرق کیسا نمایاں طور پر سامنے آگیا! اس قسم کا علم سوائے خدائے لطیف و خبیر کے اور کسے ہو سکتا ہے؟ پھر احکامات کی طرف توجہ دلائی کہ۔

یٰبُنَیَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَاصْبِرْ عَلٰی مَآ اَصَابَکَ ط اِنَّ ذٰلِکَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝ (۳۱/۱۷)

اور یاد کرو جب لقمان نے اپنے بیٹے سے کہا کہ) برخوردار صلوٰۃ کو قائم رکھنا اور معروف کا (لوگوں کو) حکم دینا اور منکر سے روکنا اور جو کچھ (مشکل یا مصیبت) تمہیں پیش آئے اس پر ثابت قدم رہنا۔ بلاشبہ یہ باتیں بہت ہی اہم باتیں ہیں۔

نظام صلوٰۃ کی پابندی اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کی ادائیگی میں انفرادی اور اجتماعی نشو و نما کی دونوں صورتیں سامنے آگئیں۔ ایک خدا شناس کے لئے اس سے بڑا جوہر اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ اللہ کے قوانین کے سامنے جھکے۔ اور ملک میں قوانین الٰہیہ کی ترویج کرے۔ اسی کا نام امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ اور جب کوئی مصیبت آجائے تو اس وقت اپنے استقلال میں لغزش نہ آنے پائے بلکہ قانون خداوندی کی تائید و نصرت کے بھروسے پر مردانہ وار اس کا مقابلہ کرے کہ یہ فی الواقعہ بڑی بات ہے۔

اس کے بعد معاشرتی اصلاح کی طرف متوجہ کیا اور فرمایا کہ۔

وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّکَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا ط اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ۝ وَاقْصِدْ فِیْ مَشْیِکَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِکَ ط اِنَّ اَنْکَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِیْرِ ۝ (۳۱/۱۸-۱۹)

اور (یاد کرو جب لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کی کہ برخوردار!) لوگوں سے (مغرورانہ طریقہ پر) منہ نہ موڑنا۔ اور نہ ہی زمین میں اکڑ کر چلنا۔ بلاشبہ خدا کسی مغرور اور متکبر کو پسند نہیں فرماتا۔ اور اپنی رفتار میں میانہ روی (اعتدال قائم) رکھنا اور آواز کو (بھی نرم اور) پست رکھنا۔ بلاشبہ آوازوں میں سب سے زیادہ قابل نفرت آواز گدھوں کی آواز ہے (جو بہت اونچی اور بہت سخت ہوتی ہے آواز کی اس بلندی اور سختی سے بچنا چاہیئے)

غور فرمایئے۔ ایک شاہزادہ کو کس طرح حسن اخلاق اور فروتنی کی نصیحت کی جا رہی ہے؟

اسلام کی سرگذشت

گذشتہ اشاعتوں میں عربوں کے قومی خصائص وامتیاز بیان کئے گئے تھے آج کی فرصت میں زمانۂ جاہلیت میں عربوں کی حیات عقلیہ کس قسم کی تھی اس پر بحث کی جائیگی۔

بہرحال طبعی حالات اور اجتماعی کوائف ہی کسی قوم کی عقلیت کو بنانے پر اثرانداز ہوتے ہیں اجتماعی کوائف یعنی وہ اجتماعی نظم جو قوم کو گھیرے ہوئے ہوں جیسے نظام حکومت، دین، قبائلی رسوم وغیرہ۔ ان دونوں عاملوں میں کوئی سا ایک عامل کسی قوم کی عقلیت پر تنہا اثر انداز نہیں ہوتا یہی وجہ ہے کہ ہیگل نے عقل یونانی اور ثقافت یونانی کے بارہ میں طبعی احوال وظروف کے اثرات کا انکار کرتے ہوئے جو کچھ کہا ہے وہ قطعاً غلط ہے۔ ہیگل کی دلیل یہ تھی کہ ترک قوم یونانی سرزمین پر آباد ہوگئی اور ان کے شہروں میں اس نے زندگی بسر کی لیکن ترکوں کو نہ یونانیوں کی ثقافت نصیب ہو سکی اور نہ انکی عقلیت ہیگل کی یہ دلیل اس لئے غلط ہے کہ ایسا ہونا اس وقت ممکن تھا اگر تنہا طبعی حالات ہی واحد مؤثر ہوا کرتے۔ پھر تو یقیناً جہاں ان کا مسلک پایا جاتا یونانی عقل بھی پائی جاتی اور جہاں کا مسلک موجود نہ ہوتا وہاں، ان کی عقل بھی موجود نہ ہوتی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ عقل یونانی دراصل دو عاملوں کا نتیجہ تھی۔ علت کے جزو کے پائے جانے سے معلول کا پایا جانا لازم نہیں ہو جاتا۔ علم الاجتماع نے اسکی مکمل وضاحت کردی ہے کہ مختلف قوموں میں ان عوامل کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ہمیں یہاں تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں۔ صرف یہ دیکھنا ہے کہ ان عوامل نے عربوں میں کیا اثرات مرتب کئے تھے۔

لہٰذا عرب — جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں ایک صحرائی علاقہ کے رہنے والے تھے جنھیں آفتاب کی گرمی تپاتی رہتی تھی۔ ان کے ہاں پانی کی بڑی قلت تھی اور ہوا خشک تھی یہ ایسے امور تھے جن کی وجہ سے درخت و پودے کثرت سے نہیں ہو سکتے تھے اور نہ کھیتیاں نشوونما پا سکتی تھیں۔ البتہ ادھر ادھر بکھرے ہوئے گھاس کے کچھ میدان ہوتے تھے اور متفرق طور پر درختوں اور پودوں کی چند خاص قسمیں کہیں پیدا ہو سکتی تھیں ان چیزوں نے ان میں یہ قدرت پیدا کردی تھی کہ وہ سخت گرمی اور خشک فضا کو برداشت کر سکیں۔ ان کی حیوانی طاقتیں وافر اور ان کے جسم نحیف ہوتے تھے۔

— انہی چیزوں نے ان میں نقل وحمل کی کمزوریاں بھی پیدا کردی تھیں — ان کے ہاں اونٹ کے سوا اور کوئی جانور عموماً چل پھر نہیں سکتے تھے۔ چنانچہ ایران و روم کی قریبی تہذیبوں کے لئے یہ دشوار تھا کہ وہ سرزمین جزیرۂ عرب کو آباد کرکے اپنی تہذیب و ثقافت کے اثرات سے مالا مال بنا سکیں۔ ان تک ان تہذیبوں کے وہ کم از کم اثرات ہی پہنچ سکے۔ جو تنگ آبادیوں اور کچے پکے منڈیوں کے ذریعہ جنھیں ہم پہلے بیان کر چکے ہیں مختلف طریقوں سے خود بخود پہنچ سکتے تھے۔

ایک دوسری چیز پر بھی غور کرنا ضروری ہے۔ یعنی یہ امر کہ اس صحرائی زندگی کے نفوس انسانی پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں:۔ بات یہ ہے کہ صحرائی زندگی — جبکہ اس کا شہری زندگی کے ساتھ مقابلہ کیا جائے — بہت ہی کم ہوتی ہے۔ اسمیں پودوں کی زندگی، جانوروں کی زندگی اور انسان کی زندگی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ صحرا کی زمین — اکثر — انسانی آثار سے خالی ہوتی ہے۔ نہ بڑی بڑی عمارتیں ہوتی ہیں۔ نہ وسیع کھیتیاں ہوتی ہیں، نہ پھوٹنے بڑھنے والے درخت ہوتے ہیں۔ صحرائی باشندہ طبیعت کا روبرو مقابلہ کرتا ہے کہ اس کے طبیعت کی طرف توجہ کرنے میں کوئی چیز حائل نہیں ہوتی آفتاب نکلتا ہے تو کوئی سایہ نہیں ہوتا۔ چاند اور ستارے نکلتے ہیں تو کوئی پردہ حائل نہیں ہوتا۔ آفتاب اپنی ظالم اور سوزاں شعاعیں پھینکتا ہے تو وہ اسکی ریڑھ کی ہڈی کے گودے کی گہرائی تک جا پہنچتی ہیں۔ چاند روشن ہوتا ہے تو اسکی پرسکون ٹھنڈی شعاعیں اسکی عقل وادراک کو جلا بخشتی ہیں آسمان میں ستارے جگمگ جگمگ کرتے ہیں تو وہ اس کے دل کو لبھا لیتے ہیں تیز رفتار آندھیوں کے جھکڑ چلتے ہیں تو جو چیز سامنے آتی ہے اسکو برباد کرتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ اس قوی، خوشنما وجمیل اور ظالم و سنگدل طبیعت کے بالمقابل حساس نفوس کا رحمان و رحیم، باری اور مصور، حفیظ اور مقیت یعنی خدائے برتر کی طرف طبعی میلان بھی تھا۔ شاید اس کا راز بھی یہی ہے کہ تینوں بڑے بڑے ادیان جن کے پیرو دنیا کی آبادی کا عظیم ترین حصہ ہیں — یہودیت، نصرانیت اور اسلام — صحرائے سینا، صحرائے فلسطین اور صحرائے عرب ہی میں پیدا ہوئے اور پروان چڑھے۔

بلاشبہ وہ سکون واطمینان جو ہمیشہ صحرا پر خیمہ انداز رہتا ہے مستعد نفوس کو شوکت و دبدبہ سے بھر دیتا اور طبیعتوں کو جلا بخشتا ہے۔ صحرا میں کوئی چیز انسانی کاریگری نہیں ہوتی بلکہ تمام چیزیں خدا کی صنعت کا شاہکار ہوتی ہیں۔ دیکھنے والے کی نگاہیں روشن آفتاب، سرگوشیاں کرنے والے ستاروں، رازونیاز کی باتیں کرنیوالے چاند ہواؤں اور آندھیوں پر ہی پڑتی ہیں جو کھلے اور وسیع فضا میں کھیلتی رہتی ہیں۔ صاف اور شفاف طبیعتوں پر یہاں ایک ایسی کیفیت چھا جاتی ہے جسے شہروں کے باشندے محسوس کرنا تو درکنار سمجھ بھی نہیں سکتے۔

صحرا کی موسیقی کا ایک ہی نغمہ ہوتا ہے جو بار بار اپنے آپ کو دہراتا رہتا ہے — ترش رو، سنگدل پر ہیبت اور شاندار موسیقی — کوئی تعجب نہیں کہ تم ان صحرا نشینوں میں ایک طرح کا نفسی انقباض یعنی غصہ — جو تمہارا جی چاہے اس کا نام رکھ لو — کی سی خاص کیفیت چھائی ہوئی دیکھو گے۔ پھر اس میں بھی کوئی تعجب نہیں کہ تم ان کے شعراء کو ایک ہی قسم کی باتیں اور ایک ہی طرح کے نغمے گاتے ہوئے پاؤ گے! کیونکہ صحرائی زندگی ان کے نفوس کو ایک ہی آواز کا عادی کردیتی ہے لہٰذا — جیسا کہ انھوں نے سیکھا ہوتا ہے۔ وہ ایک ہی طرح کے شعر گنگناتے رہتے ہیں۔

وہ ایک کشادہ فضا کی پیداوار ہوتے ہیں جس کی ہوا کو کوئی عمارت نہیں روکتی، جسکے آفتاب کو کوئی بادل نہیں ڈھانپتا جس کی بارشوں اور سیلابوں کو کوئی مقید نہیں کر دیتا۔ ہر چیز وہاں فطرت کے مطابق آزاد ہوتی ہے۔ وہ اپنے ملک کی طرح خود بھی آزاد ہوتے ہیں۔ انھیں ان کی کھیتی باڑی نہیں روکتی جس کی وہ خبرگیری کرتے ہوں، کوئی صنعت وحرفت ان کی دامنگیر نہیں ہوتی جس میں وہ اپنا وقت کاٹتے ہیں۔ ان کی طبیعتیں حکومت اور نظام کی قیود سے بھی آزاد ہوتی ہیں بجز چند باتوں کے جو ان کی عقل اور طبیعت پر پابندیاں عائد کرسکتی ہیں بت پرستانہ دین کی پابندیاں اور اس دین کی شعائر ورسوم کی پابندیاں۔ اور دوسرے اپنی قبائلی پابندیاں اور وہ پرشقت لوازم وواجبات جن کو یہ پابندیاں مستلزم ہوں وہ اپنی قبائلی پابندیوں کے لئے زیادہ مخلص اور ایمان واعتقاد میں قوی تر ہوتے تھے۔

یہ اس قسم کا ایک معاشرہ تھا جسنے ان کی معیشت کی حدبندیاں کر رکھی تھیں۔ وہ سفر کے عادی تھے، گھاس اور چارہ کی تلاش میں ہر طرف مارے مارے پھرتے رہتے تھے۔ وہ فقیر ہوتے تھے ان کی ثروت ان کے مویشیوں کی کثرت پر منحصر تھی۔ یہ ثروت ہر گھڑی طبعی رحمت کے آسرے پر جیتی تھی۔ کبھی مویشی بڑھ جاتے تھے اور کنوؤں کا پانی خشک ہو جاتا تھا۔ بارشیں کم ہوتی تھیں لہٰذا چراگاہیں بھی کم ہو جاتی تھیں۔ زندگی بدحالی کا شکار ہو جاتی تھی۔ انھوں نے بارش کا نام غَیث رکھا تو ٹھیک ہی رکھا۔ اس معاشرہ نے ان کے اخلاق وعادات اور عقلیت کی حدبندیاں بھی کردی تھیں۔ ان کی یہ تنگ معیشت ہی تو تھی جس نے سخاوت، مہمانوازی، راتوں کو آگیں جلانے تاکہ مسافر مہمان روشنی دیکھ کر اس طرف آجائیں — جیسی خصوصیات کو تمام فضائل میں سرفہرست رکھا تھا۔ ان کا یہ فقر ہی تو تھا جسنے لوٹ مار کو ان کا محبوب ترین مشغلہ بنا دیا تھا اور جسنے قبیلہ کی حمایت کو اسقدر بلند مرتبہ دیدیا تھا کہ جو شخص قبیلہ کی حمایت میں ذرا سی کوتاہی برتتا تھا وہ رسوائی اور ذلت کا نشانہ بن جاتا تھا۔ یہ قبیلہ کی حمایت ہی تو تھی جس نے انسانی جان کو اس قدر ارزاں کردیا تھا۔ زندگی جب اسی میں گھر کر رہ جائے کہ فلاں قبیلہ پر لوٹ مار کرنی ہے یا فلاں قبیلہ کی لوٹ مار کی مدافعت کرنی ہے اور اس کے ساتھ راستے غیر محفوظ ہوں۔

مجلسِ اقبال*

مثنوی اسرارِ خودی

(تمہید ـ مسلسل)

اس سے پہلے شعر میں، اقبال، اپنی اس آرزو کا اظہار کر چکا ہے کہ وہ فیضِ رومی سے مستفید ہو اور اس طرح کائنات کے اسرارِ سربستہ کو بے نقاب دیکھ سکے۔ اس کے بعد وہ پیرِ رومی سے اپنا تقابل کرتے ہوئے کہتا ہے کہ

جانِ او از شعلہ ہا سرمایہ دار
من فروغِ یک نفس مثلِ شرار

رومی بکھر بھڑکتے ہوئے شعلوں کا پیکر، اور سوز و حرارت کا تابندہ مجسمہ ہے۔ اس کے مقابلہ میں میری چمک، ایک شرارہ کی طرح، محض ایک لمحہ کے لئے ہے۔ رومی کے سوزِ عشق اور گرمیٔ محبت میں دوام اور پائندگی ہے۔ اس کے مقابلہ میں میری شعلہ سامانیاں بالکل عارضی ہیں۔ میں خلم ہوں۔ وہ پختہ ہے۔ اور میری جس قدر حرارت ہے وہ بھی اسی کی شمعِ سوزاں کی رہینِ منت ہے۔ اس لئے کہ

شمعِ سوزاں، تاخت بر پروانہ ام
بادہ شبخوں ریخت بر پیمانہ ام

اس کی شمعِ درخشندہ نے میرے پروانۂ دل پر یک لخت حملہ کیا۔ اور اسے خاکستر بنا دیا۔ اس کی شرابِ عشق نے میرے پیمانۂ قلب پر شب خوں مارا اور اس کی متاعِ صبر و ہوش کو لوٹ کر لے گئی۔ قاعدہ یہ ہے کہ پروانے شمع پر حملہ کرتے ہیں۔ اور پینے والے شراب کو لوٹتے ہیں۔ لیکن اقبال یہ کہتا ہے کہ میرے ذوق و شوق کو دیکھ کر رومی خود آگے بڑھا۔ اور مجھے اپنے سیلابِ محبت میں بہا کر لے گیا۔ اصغر کے الفاظ میں

شعلۂ ہر خود بیتاب ہے جذبِ تمنا سے
حقیقت ورنہ سب معلوم ہے پروازِ شبنم کی

لیکن یہ اقبال کا ابتدائی دور تھا۔ ورنہ بعد میں وہ رومی تو ایک طرف، خدا کے متعلق کہہ گیا ہے کہ

یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ

بہرحال وہ کہتا یہی ہے کہ

پیرِ رومی خاک را اکسیر کرد
از غبارم جلوہ ہا تعمیر کرد

پیرِ رومی کی نگاہِ گرم نے میری خاک کو اکسیر کر دیا۔ اور میرے اس غبار سے رنگا رنگ کے ہزاروں جلوے تعمیر کر دیئے۔ اور خود میری خفیہ صلاحیتوں کو اس درجہ بیدار کر دیا کہ مجھ میں یہ ہمت اور جرأت پیدا ہو گئی کہ میں بلند سے بلند حقائق تک اپنا ہاتھ بڑھا سکوں۔ چنانچہ

ذرہ از خاکِ بیاباں رخت بست
تا شعاعِ آفتاب آرد بدست

ذرہ کا اصل مستقر تو خاکِ بیاباں میں ہوتا ہے۔ مگر رومی کا اثر یہ تھا کہ اس ذرہ نے اپنے مستقرِ خاکی سے اپنا رختِ سفر باندھ لیا۔ اور فضا کی پہنائیوں میں محوِ پرواز ہو گیا۔ اس عزمِ بلند کے ساتھ کہ وہ شعاعِ آفتاب کو اپنی گرفت میں لے لے۔ یہ سب کچھ فیضِ رومی کے اثر سے ہوا۔

موجم و در بحرِ او منزل کنم
تا دُرِ تابندۂ حاصل کنم

میری ہستی محض ایک موج کی سی ہے۔ جس کی منزل رومی کا بحرِ بے کراں ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ

موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

اور یہ سب اس لئے کہ میں اس طرح آغوشِ رومی میں سکون پذیر ہو کر زندگی کا گوہرِ تابندہ حاصل کر سکوں۔

من کہ مستی ہا ز صہبائش کنم
زندگانی از نفسہائش کنم

میری تمام مستیاں شرابِ رومی کی کیف انگیزی سے ہیں۔ نہیں! بلکہ یوں کہئے کہ میری تمام زندگی ہی نفسہائے رومی کی رہینِ منت ہے۔ پیکر مرا ہے۔ اس میں سانس رومی کا ہے۔ شراب میری ہے۔ اس میں کیف رومی کا ہے۔

※

اس کے بعد اقبال بتاتا ہے کہ اس کی فضائے فکر پر رومی کس طرح جلوہ بار ہوا، اسے وہ محاکاتی انداز سے یوں بیان کرتا ہے کہ

شب، دلِ من مائلِ فریاد بود
خامشی از یاربم آباد بود

ایک رات کا ذکر ہے کہ میں اپنی تنہائیوں میں بیٹھا، خدا سے ناسازگاریٔ حالات کا شکوہ کر رہا تھا۔ ہر طرف سناٹا ہی سناٹا تھا۔ اس چار سو خاموشی کو کوئی توڑنے والی آواز تھی تو یارب کے نعرہ کی تھی۔ جو مسلسل آہوں کے ساتھ میرے لب پر آ رہی تھی۔

شکوہ آشوبِ غمِ دوراں بُدم
از تہی پیمانگی نالاں بُدم

میں غمِ روزگار سے شکوہ سنج تھا۔ حالات کی ناسازگاری سے نالاں تھا۔ اور بحضور ربُّ العزت یہ شکایت کر رہا تھا کہ دوسروں کے میکدوں کے میکدے آباد ہیں۔ اور میری حالت یہ ہے کہ ایک چھوٹا سا جامِ صہبا بھی بالکل خالی ہے۔ میرے آہ و نالہ اور گریہ و فغاں کے یہ جذبات اس قدر شدید ہوئے کہ میں دعا مانگتا مانگتا سو گیا۔

ایں قدر نظارہ ام بیتاب شد
بال و پر بشکست و آخر خواب شد

یہ شہپرِ نظارہ اس قدر پھڑپھڑایا کہ اس کے بازو اور پر سب ٹوٹ گئے۔ اور اس کی بیتابی مائل بہ سکون ہو گئی۔ اور مجھے نیند آ گئی۔ خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ

روئے خود بنمود پیرِ حق سرشت
کو بحرفِ پہلوی قرآں نوشت

سامنے پیرِ رومی کھڑے ہیں۔ وہ پیرِ رومی جنہوں نے اپنی مثنوی میں قرآن کو فارسی زبان میں لکھ دیا ہے۔

ہم سابقہ قسط میں بتا چکے ہیں کہ اقبال کو رومی سے کس قدر عقیدت تھی۔ یہ دونوں جذبات اسی عقیدت مندی کا نتیجہ ہے۔ ورنہ جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ عام عقیدہ کہ

مثنویٔ مولوی معنوی
ہست قرآں در زبانِ پہلوی

کس حد تک حقیقت پر مبنی ہے! اس میں شبہ نہیں کہ اقبال نے رومی کے ہاں سے بھی بڑی حد تک وہی کچھ لیا ہے۔ جو قرآن کے مطابق ہے۔ لیکن اس کے باوجود رومی کے متعلق اقبال کا اس درجہ اظہارِ عقیدت، بہت سوں کے لئے ایک شدید غلط فہمی کا موجب بن گیا ہے۔ بڑی حد تک اس کی ذمہ دار یہ چیز بھی ہے کہ اقبال نے اپنے اظہارِ مدعا کے لئے پیرایۂ بیان شعر کا اختیار کیا۔ شاعری میں ہوتا یہی ہے کہ مضامین کی آمد سے انسان یہ بھول جاتا ہے کہ اسے کہاں رکنا چاہیئے۔

بہرحال خواب میں رومی اقبال کے سامنے آ گئے۔

ذاتی ملکیت
کا اصول
مُلّا کے نزدیک بڑا مقدس ہے
لیکن اس کے بارے میں
قرآن کا حکم کیا ہے
اس کی تفصیل
"نظامِ ربوبیت"
میں دیکھئے

عورت کا قرآن

(۱۷)

قرآن پیغام لایا تھا کہ:۔

وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِیْحُکُمْ (انفال ۶)

"دیکھو خبردار! تم لوگ آپس میں نزاع نہ کرنا، ورنہ کمزور ہو جاؤ گے اور سارے لوگوں پر سے تمہاری دھاک اٹھ جائے گی"

قرآن نے مسلمانوں کو تاکید کی تھی کہ:۔

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ... وَلَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَھُمُ الْبَیِّنٰتُ ؕ وَاُولٰٓئِکَ لَھُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ (آل عمران ۱۱)

"دیکھو، تم لوگ اللہ کی ایک رسی کو سب مل کر پکڑے رہنا۔ اور تم میں باہم اختلاف کبھی نہ ہونے پائے ... اور تم لوگ ان قوموں کی طرح نہ ہو جانا جنھوں نے اللہ کی طرف سے واضح احکام اور ہدایت پہونچ جانے کے باوجود آپس میں تفریق کر لی تھی۔ اور باہم اختلاف کرنے لگے تھے۔ ایسا کرنے والے بڑی سخت سزا کے مستحق ہیں۔

قرآن نے بتایا تھا کہ اسلام میں گروہ بندی حرام اور ٹولیوں ٹولیوں میں بٹ جانا شرک ہے۔

وَلَا تَکُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ مِنَ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَھُمْ وَکَانُوْا شِیَعًا۔ (روم ۴)

دیکھو تم لوگ مشرک نہ ہو جانا۔ جنھوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر لیا ہے۔ اور مختلف جماعتوں اور گروہوں میں بٹ گئے ہیں۔

قرآن نے تو رسول اللہ تک کو سمجھا دیا تھا کہ:۔

اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَھُمْ وَکَانُوْا شِیَعًا لَّسْتَ مِنْھُمْ فِیْ شَیْءٍ (انعام ۲۰)

دیکھو اے رسول! جو اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیں اور مختلف گروہوں میں بٹ جائیں۔ وہ تم میں سے نہیں ہیں۔ اور تمہارا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

مگر مسلمانوں کا یہ حال کہ وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے ہیں۔ مختلف گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ الگ الگ جماعتیں ہیں۔ اور ان میں سے ایک دوسرے سے اس طرح بے تعلق ہے۔ گویا دوسری جماعت "مسلمان" ہی نہیں ہے۔ یہ حال اس وجہ سے ہے کہ اب اسلام کی کتاب "قرآن" نہ رہی اور اب مسلمانوں کے سامنے صرف "احادیث" اور "فقہ" کی کتابیں ہیں۔ مولانا مسعود عالم ندوی ۱۹۴۹ء میں حج کو گئے تھے۔ وہاں ایک مسئلے کے بارے میں علماء نے کہ معظمہ میں جواب دیا کہ:۔

"تم حنفی ہو تو پھر تمہیں حدیث تلاش کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ فقہائے حنفیہ کا فتویٰ معلوم کر لینا کافی ہے" (دیارِ عرب میں ص ۲۴)

ذرا غور فرمایئے "قرآن" کا نام تک نہیں لیا گیا۔ یہ کعبے کا حال ہے۔ "چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی"

میری بہنو! یاد رکھیے کہ اسلام میں گروہ بندی حرام ہے۔ تفریق شرک ہے۔ مگر مسلمان تفریق ہی کو اسلام سمجھ رہے ہیں۔ ذرا غور کیجئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے پیغمبر بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کے ساتھ تھے کہ مصر سے نکلنے کے بعد بنی اسرائیل کو حضرت ہارون کے سپرد کر کے حضرت موسیٰ کوہِ طور پر تشریف لے گئے۔ اس درمیان میں بنی اسرائیل نے گوسالہ پرستی شروع کر دی۔ حضرت ہارونؑ نے منع بھی کیا مگر وہ نہ مانے۔ حضرت موسیٰ کو وحیِ الٰہی نے بتایا کہ تمہاری قوم نے گوسالہ پرستی شروع کر دی ہے۔ وہ غصہ میں بھرے ہوئے تشریف لائے۔ آپ نے حضرت ہارونؑ کو ڈانٹا کہ تم نے ایسا کیوں ہونے دیا؟ اب ذرا دیکھئے کہ حضرت ہارونؑ کیا جواب دیتے ہیں! انھوں نے فرمایا کہ ہم نے سمجھایا تو ان لوگوں کو بہت مگر وہ نہ ملتے، البتہ زیادہ سختی میں نے اس لئے نہ کی کہ:۔

اِنِّیْ خَشِیْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَیْنَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِیْ - (طٰہٰ ۵)

میں اس بات سے ڈر گیا کہ کہیں آپ (آکر) یہ نہ کہنے لگیں کہ تو نے بنی اسرائیل میں پھوٹ ڈال دی اور میرے حکم کا پاس نہ کیا۔

ذرا سوچئے کہ "تفرقہ اندازی" اتنا بڑا "شرک" ہے کہ ایک پیغمبر نے "گوسالہ پرستی" کے نسبتاً چھوٹے شرک کو تو گوارا کر لیا۔ مگر بڑے شرک "فرقہ پرستی" کو گوارا نہ کیا۔ یعنی یہ پسند نہ کیا کہ بنی اسرائیل مختلف ٹولیوں اور جماعتوں میں بٹ جائیں۔ مگر مسلمان! اللہ اللہ رونے کی بات ہے کہ وہ سینکڑوں ٹولیوں اور جماعتوں میں بٹ گئے۔ اور بقول قرآن:۔

کُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَیْھِمْ فَرِحُوْنَ (روم ۴)

"ہر گروہ اپنے ان اعتقادات پر خوش ہے جنہیں وہ لئے بیٹھا ہے"

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جیسا کہ فرمایا تھا۔ مسلمانوں کی دھاک اٹھ گئی۔ اور وہ کہیں کے نہ رہے، آج دنیا میں وہ سب سے زیادہ ذلیل ہیں۔

بہرحال آپ یہ خوب سمجھ لیں کہ "اسلام" کوئی مذہب نہیں ہے۔ جس کا تعلق صرف چند رسومات کی ادائیگی سے ہو بلکہ یہ "دین" ہے۔ جس کو "قانون" یا "نظام" کہا جاتا ہے۔ اور جو "دین" اور "دنیا" دونوں کے لئے ہدایت ہے۔ اور جس کو ہماری زندگی کے ہر شعبے میں دخل ہے اور اس نظامِ اسلامی کا ایک اور صرف ایک ہی دستور العمل ہے۔ جس کو "قرآن" کہا جاتا ہے اس لئے اسلام صرف قرآن میں ہے جسے رسول اللہ صلعم خود مرتب کر کے دے گئے تھے جس کو صحابہ کرام نے پھیلایا تھا۔ جس کو امامین نے اپنایا تھا۔ اور جس کے ذریعے عورت فرش سے اٹھ کر عرش تک پہونچ گئی تھی۔ اور یہ قرآن ہی ہے جس کو اگر مسلمان مرد و عورت پھر اپنائیں گے، تو پھر فائز المرام ہو سکتے ہیں۔ اگر خود ساختہ اسلام کو کلیجے سے لگائے رہے تو مسلمان ہمیشہ اسی حال میں قعرِ مذلت میں پڑے رہیں گے۔ اور کبھی باوقار نہ ہو سکیں گے۔ چاہے جس قدر بھی سر پٹکیں ؎

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم
نہایت اس کی حسینؓ، ابتدا ہے اسمٰعیلؑ (اقبال)

لہٰذا میں اپنی بہنوں کو مشورہ دیتی ہوں کہ مروجہ مذہب اسلام سے ہٹ کر خدا کے لئے قرآن پاک کا توجہ اور گہری نظر سے مطالعہ کر کے یہ جاننے کی کوشش کیجئے کہ واقعی اسلام کیا ہے اور "دین" کہتے کس کو ہیں؟

اے کہ نہ شناسی "خفی" را از "جلی" ہشیار باش
اے گرفتارِ ابوبکرؓ و علیؓ ہشیار باش (اقبال)

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُھَا (محمد ۳)

یہ لوگ قرآن میں غور و فکر کیوں نہیں کرتے؟ کیا دلوں پر تالے لگ گئے ہیں؟

اُتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنْ کِتَابِ رَبِّکَ ۚ لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِہٖ (کہف ۴)

تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہاری طرف جو کتاب وحی کی گئی ہے اس کی پیروی کرو۔ کوئی اس کے کلمات کو بدل نہیں سکتا۔

قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰہُ مَا تَلَوْتُہٗ عَلَیْکُمْ وَلَآ اَدْرٰىکُمْ بِہٖ (یونس ۲)

"کہدو کہ اگر خدا کو منظور نہ ہوتا تو نہ تو میں تم کو یہ قرآن پڑھ کر سناتا۔ اور نہ اللہ تم کو اس کی اطلاع دیتا"

اِنَّہٗ لَذِکْرٌ لَّکَ وَلِقَوْمِکَ (زخرف ۴)

"یہ قرآن تمہارے لئے اور تمہاری قوم کے لئے بڑے شرف کی چیز ہے"

گوا: ہندوستان اور پرتگال کی استخوان نزاع

تاریخ میں شاید ایسی مثال ڈھونڈھے سے بھی نہیں ملیگی کہ کوئی قوم غیر ملکی غلامی سے آزاد ہوتے ہی ہمسایوں کی آزادی کے درپے ہو گئی ہو۔ اور اس کے نزدیک آزادی کا مفہوم اپنی تعمیر سے کہیں زیادہ اوروں کی تخریب ہو جائے۔ ایسی مثال ہندوستان نے قائم کی کم و بیش نصف صدی کی جدوجہد کے بعد ہندوستان کو آزادی نصیب ہوئی۔ لیکن نئی فضا میں آنکھ کھول کر اس نے دیکھا کہ اس کے مشرق اور شمال مغرب میں آزاد مسلمان مملکت قائم ہے۔ ان مسلمانوں کی حکومت تھی جسے آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو قابل اعتنا سمجھنا خلاف شان سمجھتے تھے اور کوئی دس سال پیشتر انھوں نے بڑی ڈھٹائی سے کہہ دیا تھا کہ برصغیر ہند میں دو طاقتیں ہیں۔ ایک انگریزی اور دوسری ہندو کانگریس کی۔ یہ منظر ہند کو ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا لیکن یہ منظر اور ڈراؤنا ہو گیا جب جوناگڑھ، مانگرول اور مناوادر کی ریاستوں نے پاکستان سے الحاق کا اعلان کر دیا۔ حیدرآباد کی ریاست سے متعلق یہ شبہ پیدا ہو گیا کہ وہ آزادی کا اعلان کرے گی اور ریاست کشمیر کی مسلمان آبادی کے متعلق یہ یقین ہو گیا کہ وہ پاکستان سے الحاق کرے گی۔

ہندوستان نے ایڑی چوٹی کا زور لگانا شروع کر دیا کہ ایسا نہ ہو۔ چنانچہ ایک طرف پاکستان کے خلاف مہم شروع ہوئی۔ مسلمانان ہندوستان کو دہشت زدہ کر کے گھروں سے نکالا جانے لگا تاکہ وہ نہایت بے سروسامانی کی حالت میں بھاگ کر پاکستان میں پناہ لیں اور اس کی معیشت کو تباہ کر دینے کا باعث بنیں۔ یہ وار بڑا کارگر تھا۔ لیکن اللہ کی توفیق شامل حال نہ ہوتی تو پاکستان اس سیلاب ہلاکت میں غرق ہو جاتا۔ پاکستان کو یوں الجھا کر ہندوستان نے کشمیر کا رخ کیا۔ آناً فاناً اس کی فوجیں ریاست میں پہنچ گئیں اور اہل کشمیر کے لئے استبداد کا نیا اور جاں گسل دور شروع ہو گیا۔ یہ پاکستان کی معیشت پر ایک اور وار تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ پاکستان کشمیر سے آنے والے زندگی بخش دریاؤں کے پانی سے محروم ہو کر خوراک اگلنے کے قابل نہ رہے اور فاقوں مر جائے۔ کشمیر میں پاکستان کی شہ رگ کو قابو کر کے ہندوستان نے جوناگڑھ وغیرہ میں نام نہاد تحریک "آزادی" شروع کرا دی۔ ہندوستانی "رضاکار" ہندوستانی علاقے سے ہندوستانی حکومت کی مدد سے جوناگڑھ پہنچ گئے اور اسے "آزاد" کرا لیا۔

یہ معرکہ نوعیت کے اعتبار سے عجیب تھا۔ ہجوم مصائب میں پاکستان اس جنگ کے تقاضوں کو کما حقہٗ نہ سمجھ سکا۔ چنانچہ وہ ہندوستان کا حریف نہ ہو سکا۔ ہندوستان نے دراصل پاکستان کی اسی پوزیشن کا فائدہ اٹھایا۔ استعماریت کا یہ پہلا معرکہ سر ہوتا نظر آیا تو ہندوستان کے حوصلے بڑھ گئے۔ اب اس نے اور جبر سے کام لیا اور حیدرآباد دکن پر چڑھ دوڑا۔ دو ایک روز میں ہی نظام کی بے تدبیری کے ہاتھوں سلطنت آصفیہ ہندوستان کا حصہ بن گئی۔ استعماریت کا یہ دوسرا معرکہ تھا جس کا نتیجہ ہندوستان کے حق میں رہا اور جس سے اس کے حوصلے اور بڑھ گئے۔

اس سلسلہ کا تیسرا معرکہ فرانس سے پیش آیا۔ فرانس دوسری عالمگیر جنگ سے بالکل چور ہو کر نکلا تھا۔ لیکن اسے ستانے کا کوئی موقعہ نہ ملا۔ ہند چینی اور مغرب اقصیٰ کی شورش اور بدامنی نے اسے اور بے دست و پا کر دیا۔ چنانچہ وہ بھی ہندوستان کا حریف نہ ہو سکا۔ اس نے اپنے مقبوضات رفتہ رفتہ ہندوستان کی تحویل میں دے دیئے۔ ہندوستان اس طرح کامیابی پر کامیابی حاصل کئے چلا جا رہا تھا کہ اس کا واسطہ ایک نئے حریف سے پڑا۔ یہ حریف سرخ چین تھا۔ وہ بڑھتے بڑھتے تبت تک پر قابض ہو گیا تھا۔ تبت کا علاقہ تقسیم سے پیشتر انگریز کے زیر اثر تھا۔ اور اس میں ہندوستانی چوکی قائم تھی۔ ہندوستان نے اسے غنیمت جانا۔ اور شمال کی طرف توسیع کا ذریعہ سمجھا۔ اس نے بڑی بے تکلفی سے دنیا کی چھت پر چڑھنے کے لئے استعماریت کی سیڑھی آگے بڑھائی۔ لیکن چین نے جو پہلے ہی سے وہاں موجود تھا اسے الٹا دیا۔ تبت کے ساتھ ساتھ ہندوستان نے شمال کی چھوٹی سی ہمالیائی ریاست نیپال میں بھی اثر و دخل پیدا کرنا شروع کر دیا تھا۔ چین نیپال تک براہ راست تو نہیں پہنچ سکا۔ لیکن اس ریاست میں اشتراکیت ضرور نمودار ہو گئی ہے۔ یہ تحریک ہنوز ابتدائی مراحل میں ہے۔ لیکن یہ توقع سے کہا جا سکتا ہے کہ اس ریاست میں ہندوستان اور چین کی جنگ شروع ہو گئی ہے۔

چین ہندوستان کی سرحد پر آ بیٹھا تو ہندوستان کو معلوم ہوا کہ یہ کم و بیش بارہ سو میل کی مشترک سرحد بالعموم غیر متعین ہے۔ چین نے جگہ بہ جگہ اس عدم تعین کو مفید مطلب بنایا اور حسب فرصت اور موقعہ ان میں رد و بدل کیا۔ ہندوستان کے لئے یہی کچھ کم تشویشناک نہ تھا کہ اس نے دیکھا کہ چین کا سایہ لمبا ہو کر سارے جنوب مشرقی ایشیا تک چھا رہا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اندرون ہند بھی کئی علاقے اشتراکیت کی زد میں آ گئے تھے۔ اس صورت حال کا مقابلہ ناممکن تھا۔ چنانچہ ہندوستان نے اس سے مطابقت پیدا کرنی شروع کر دی۔ تبت سے پسپا ہو کر اس نے چین سے دوستی کی طرح ڈالی۔ ہندوستان نے اس دوستی میں دو فائدے دیکھے۔ ایک تو یہ کہ چین ہندوستان کا لحاظ کرے گا۔ اور اسے اپنی توسیع کا نشانہ نہیں بنائے گا۔ اور دوسرے یہ کہ چین کی طرف اس کا جھکاؤ دیکھ کر امریکہ اس کی اور زیادہ خوشامد کرے گا۔

گو چین کے معاملے میں ہندوستان نے زک اٹھائی لیکن اس شر میں اس کے لئے ایک حد تک یا وقتی طور پر خیر کا پہلو نکل آیا ہندوستان اس شکست سے متعلق دھوکے میں تو نہیں رہا۔ لیکن اس کے لئے فی الحال اس میں تسکین کا سامان ضرور ہے۔ اب ہندوستان نے ایک اور طرف رخ کیا اور پرتگال کو نشانہ بنایا اور مطالبہ کیا کہ وہ اپنے "ہندوستانی مقبوضات" سے دستکش ہو جائے۔ ہندوستان کو توقع تھی کہ جس طرح اس کی استعماریت کی گنگا کشمیر، حیدرآباد، جوناگڑھ اور فرانسیسی مقبوضات کو نگل گئی ہے، اسی طرح پرتگال بھی ایک تر نوالہ ثابت ہوگا۔ لیکن اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب پرتگال نے گرز اٹھا کر گنگا میں ڈال دینے اور ہندوستان کے آگے ڈنڈوت بجا لینے کی بجائے اینٹ کا جواب پتھر سے دیا۔

ہندوستان اور پرتگال کی کشمکش کو سمجھنے کے لئے پرتگال کے "ہندی مقبوضات" کا پس منظر جاننے کی ضرورت ہے۔ پرتگالی علاقے کا رقبہ ۱۵۳۰ مربع میل ہے۔ اس میں سب سے بڑا اور قابل ذکر گوا ہے جو ۱۳۷۰ مربع میل ہے۔ باقی علاقے دمن اور دیو ہیں۔ یہ علاقے جنوبی ہندوستان میں مغربی گھاٹ پر واقع ہیں۔ گوا ایک بندرگاہ ہے اور اس کا ساحل ۶۲ میل لمبا ہے۔ اس صوبے کے دو حصے ہیں۔ ایک نیا ایک پرانا۔ پرانا حصہ اس علاقے پر مشتمل ہے جس پر پرتگیز سولہویں اور سترھویں صدی میں تجارت کی غرض سے آباد ہوئے۔ نیا علاقہ کوئی تین سو سال بعد مرہٹوں کے زوال کے بعد ان کے تصرف میں آیا۔ پرانا علاقہ کم و بیش پرتگیزی ہے۔ اس کے باشندے زیادہ تر عیسائی ہیں۔ اور ان کے نام پرتگیزوں کی طرح ہیں۔ یہ لوگ خوش حال بھی ہیں۔ نیا علاقہ جو پرانے علاقے کے حوالی میں ہے آٹھ اضلاع میں بٹا ہوا ہے۔ اس میں عیسائی ہیں لیکن ہندوؤں کی اکثریت ہے۔ دونوں فرقے رہتے تو امن و امان سے ہیں لیکن فرقہ وارانہ امتیاز موجود ہے۔ دمن بمبئی سے ایک سو میل شمال کی جانب ہے اور اس کا رقبہ ۱۴۸ مربع میل ہے۔ دیو کاٹھیاوار کے سامنے ایک جزیرہ ہے یہ جزیرہ [illegible] مربع میل ہے لیکن اس سے متصل مجموعی علاقہ لے ۲۰ مربع میل ہے۔ پرتگالی علاقے مغربی گھاٹ پر واقع ہونے کی بدولت بڑے سرسبز ہیں کیونکہ ان میں مئی سے اکتوبر تک خوب بارشیں ہوتی ہیں۔ گوا زیادہ تر پہاڑی علاقہ ہے اور اس میں بعض نہایت قابل دید قدرتی مناظر ہیں۔

ان علاقوں پر بالخصوص گوا پر پرتگیزی رنگ بہت نمایاں ہے۔ پرتگیزی آمد کے بعد ایک تو عیسائی مشنریوں کی آمد اور تبلیغ کا وسیع سلسلہ شروع ہو گیا۔ دوسرے پرتگیزوں نے اخلاقی طور پر اچھے معیار قائم کئے مثلاً البوکرک جو گوا کا دوسرا افسر اعلیٰ تھا پرتگیزی سپاہیوں اور ہندوستانی عورتوں کے ناجائز اختلاط کو اخلاقاً روا نہیں سمجھتا تھا البتہ جو پرتگیزی سپاہی ہندوستانی عورتوں سے شادی کرنا چاہتے تھے انھیں اس کی مکمل اجازت تھی۔ اس طرح گوا قلیل مدت میں عیسائی ہو گیا۔ اور وہاں کے باشندے ایسے ہو گئے جن کے ماں باپ مخلوط نسل کے تھے۔ ان باشندوں کو گوا اور پرتگال دونوں میں مساوی حقوق حاصل تھے۔ چنانچہ اب پرانے حصہ میں جو آبادی پائی جاتی ہے اس میں معتدبہ حصہ ہندوستانیوں ہی کی اولاد ہے لیکن ان کے نام اور طرز بود و ماند پرتگیزوں کے سے ہیں۔ گوا اور پرتگال میں صدیوں کے میل جول سے اتنا گہرا اختلاط پیدا ہو گیا ہے کہ اہل گوا اپنے آپ کو باقی ہندوستان سے ایک جداگانہ برادری سمجھتے ہیں۔ ان کا گردو پیش کی زندگی کا احساس اتنا قوی ہے کہ وہ جہاں کہیں بھی جاتے ہیں اکٹھے رہتے ہیں اور جداگانہ تشخص برقرار رکھتے ہیں۔ ان کے کلب تک علیحدہ ہوتے ہیں۔ وہ کافی تعداد میں دوسرے ملکوں میں آباد ہیں۔ اور ایک عرصے سے وہیں رہ رہے ہیں۔ لیکن ان کا وطن سے تعلق منقطع نہیں ہوا۔ ہندوستان میں ان کی تعداد ایک لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ پاکستان میں وہ تیس ہزار کے قریب ہیں

صرف کراچی میں ان کی تعداد دس ہزار ہے۔

گوا کی سیاسی حیثیت کیا ہے؟ ہندوستان اسے استعماریت کے باقیات میں سے سمجھتا ہے۔ اور اپنے چہرے پر بدنما چھائی سے موسوم کرتا ہے۔ لیکن یہ حقیقت نہیں۔ پرتگال نے گوا کو شروع سے ہی ایک مستعمرہ کی حیثیت سے رکھنے کی بجائے اسے اپنے برابر سیاسی رتبہ دیا۔ اس نے محض اعلان ہی نہیں کیا بلکہ اس پر عامل بھی رہا کہ پرتگال اور گوا میں کوئی سیاسی امتیاز نہیں اور ان کا باہمی تعلق حاکم اور محکوم کا نہیں بلکہ ایک ہی ملک کے مختلف حصوں کا ہے نیز پرتگال گوا سے کچھ کمانے کی بجائے گراں قدر رقم اس پر صرف کرتا ہے۔ مثلاً گوا کا سالانہ بجٹ ۲۵ لاکھ پونڈ کے لگ بھگ ہے اور کم و بیش یہ ساری رقم گوا میں ہی صرف ہوتی ہے۔ پرتگال اس کو ہر سال ۵۰۰،۸۰ پونڈ کی مدد دیتا ہے۔ بجٹ میں مدد کے علاوہ وہ اور کئی طریقوں سے گوا کی مدد کرتا ہے۔ اندریں حالات یہ نہیں کہا جا سکتا کہ پرتگال گوا کو بہ حیثیت مستعمرہ استعمال کرتا ہے اور کسی قسم کے استحصال کا مجرم ہے۔ اس تعلق نے دونوں ممالک کو ثقافتی اعتبار سے ایسا ہم آہنگ بنا دیا ہے کہ ڈاکٹر سلازر وزیر اعظم پرتگال کے الفاظ میں ہندوستان کے راستے گوا میں داخل ہو کر ایسا نظر آتا ہے کہ ایک نئی انسانی سرحد عبور کر لی گئی ہے۔ گوا ثمرہ ہے مشرقی آب و گل میں مغربی ثقافت کی تخم ریزی کا یہ پرتگال کے ہاتھوں ہی ممکن ہو سکتا تھا کیونکہ دیگر یورپی اقوام کے برعکس پرتگال مشرق میں غلاموں کی تلاش میں نہیں آیا بلکہ اہل مشرق کو تہذیب و تمدن کی دولت سے بہرہ ور کر کے اپنے برابر دینے میں ساعی رہا۔

پرتگال نے جس محنت سے گوا کی آبیاری کی ہے اس نے گوا کے مسئلہ کی نوعیت بدل دی ہے۔ ہندوستان نے خیال کیا کہ وہ استعماریت استعماریت پکاریگا تو پرتگال فرانس کی طرح بوریا .... بستر باندھ کر چپکے سے چل دے گا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا اور فروری سنہ ۱۹۵۰ء میں جو مذاکرات باہمی کی طرح ڈالی گئی تھی وہ اب تک کوئی نتیجہ نہیں پیدا کر سکے۔ پرتگال کی طرف سے ہندوستان کو بار بار یہی جواب دیا جاتا ہے کہ پرتگیزی دستور اس کی بالکل اجازت نہیں دیتا کہ ملک کا کوئی حصہ فی سبیل اللہ کسی دوسرے ملک کو دیدیا جائے۔ پرتگال کا رویہ دیکھ کر ہندوستان نے جنوری سنہ ۱۹۵۳ء میں نئی تجویز پیش کی۔ یعنی یہ کہ اگر گوا سے مل جائے تو وہ اس کے ثقافتی حقوق، زبان، قانون، رسم و رواج کو محفوظ رہنے دے گا۔ اس کا پرتگال پر کوئی اثر نہ ہوا اور اس نے پہلا سا جواب دے کر اس تجویز کو مسترد کر دیا۔

اب ہندوستان آپے سے باہر ہو گیا اس نے بالکل ہٹلر کے نقش قدم پر چلنا شروع کیا۔ ہٹلر ہمسایہ ممالک سے پہلے تو یہ مطالبہ کرتا تھا کہ ان کی حدود کے اندر جو جرمن آبادی ہے جو جرمن قوم کے باشندے ہیں۔ وہ جرمنی کو دیدیئے جائیں۔ جب اس مطالبہ کو منظور نہیں کیا جاتا تھا تو اس کی طرف سے یہ مہم شروع ہو جاتی تھی کہ جرمنوں پر بے تحاشا مظالم توڑے جا رہے ہیں۔ چنانچہ اس بہانے سے حملہ کر کے وہ پھر ان علاقوں کو کیا سارے ملکوں کو اپنے قبضہ میں کر لیا کرتا تھا۔ ہندوستان نے بعینہٖ یہی کیا۔ اس کے اخبارات اور ارباب حکومت و سیاست نے یہ کہہ کہہ کر آسمان سر پر اٹھا لیا کہ گوا میں سیاسی آزادی نہیں۔ پرتگال نے رعایا پر عرصہ حیات تنگ کر رکھا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ چنانچہ مئی سنہ ۱۹۵۳ء میں حکومت ہند نے حکومت پرتگال کو ایک یادداشت بھیجی جس میں تحریر تھا کہ ان حالات میں ہندوستان کے لئے لزبن (دار الحکومت پرتگال) میں سفارت خانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ دوسرے مہینے (۱۱ر جون کو) اسے بند کر دیا گیا۔ سفارتی تعلقات کا انقطاع مہذب ممالک کے مابین جنگ سے ورے انتہائی اقدام ہوتا ہے۔ ہندوستان نے سمجھا کہ پرتگال اس سے مرعوب ہو جائے گا اور وہ اسے مشکور کرے گا۔ لیکن اس کا رویہ بدستور سابق رہا اور اس میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔

جولائی سنہ ۱۹۵۳ء میں ڈاکٹر سلازر نے جو اعلان کیا وہ پرتگال کی روش کا آئینہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ "ہم نہ استصواب کے ذریعہ نہ اس کے بغیر کبھی اپنے ملک کے کسی حصے یا اس کی آبادی کے انتقال سے متعلق گفتگو کرنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتے۔ ہم کیا پرتگال کی کوئی حکومت اس کے لئے تیار نہیں ہو سکتی کیونکہ نہ ہمارا آئین اس کی اجازت دیتا ہے نہ ہمارا ضمیر۔" ڈاکٹر سلازر اس کے لئے البتہ رضامند ہے کہ چونکہ گوا کی سرحد ہندوستان سے ملتی ہے اور ہندوستان کو شکایت ہے کہ گوا کے ذریعہ ناجائز مال کی تجارت ہوتی ہے اس لئے وہ دونوں مل کر ایسے اقدامات کریں جن سے اگر ایسا ہوتا ہے تو اس کا سلسلہ ختم ہو جائے۔ نیز انھوں نے اس کے لئے بھی رضامندی کا اظہار کیا کہ وہ ہندوستان کی تسلی کر سکتے ہیں کہ گوا میں اس کے خلاف کسی قسم کی جنگی تیاری نہیں ہو گی اور نہ گوا کو ہندوستان کے خلاف محاذ جنگ کے طور پر استعمال ہونے دیا جائے گا۔ ہندوستان نے ان تجاویز کو قابل اعتنا نہ سمجھا کیونکہ وہ الحاق سے کم پر راضی نہیں ہو سکتا تھا۔

کوئی عجب نہ تھا کہ حیدرآباد، جوناگڑھ، کشمیر وغیرہ کی طرح ہندوستان پرتگال سے سفارتی تعلقات منقطع کرنے کے بعد گوا پر حملہ کر دیتا۔ لیکن اب اس کا پالا کسی ناتواں حریف سے نہیں تھا۔ پرتگال نہ محض دباؤ میں آنے والا نہیں تھا بلکہ پرتگال اور گوا کی مخصوص حیثیت نے اس مسئلہ کو بین الاقوامی توجہ کا مرکز بنا دیا تھا۔ گوا کے باشندے زیادہ تر کیتھولک ہیں۔ اس بنا پر انھیں تمام کیتھولک دنیا کی ہمدردیاں حاصل تھیں۔ مزید برآں پرتگال کے دیگر اقوام یورپ سے ایسے معاہدے تھے کہ وہ گوا پر حملہ کی صورت میں ان سے مدد لے سکتا تھا۔ مثلاً برطانیہ سے اس کا کم و بیش سات سو سال پرانا معاہدہ ہے۔ جو وقتاً فوقتاً حالات زمانہ کے مطابق بدلتا رہا ہے۔ اس کی رو سے جنگ کی صورت میں اگر پرتگال برطانیہ سے استمداد کرے تو برطانیہ اس کا پابند ہو گا۔ پرتگال ناٹو کا رکن ہے اس نے صاف طور پر کہہ دیا ہے کہ اگر ضرورت پڑی تو دیگر ارکان سے وہ گوا کے معاملہ میں مشورہ لے گا۔ مزید برآں ....

برطانیہ نے ہندوستان کو یادداشت بھیجی اور گوا سے متعلق تشویش کا اظہار کرتے ہوئے اس امید کا اظہار کیا کہ ہندوستان کوئی ایسا قدم نہیں اٹھائے گا جس کا نتیجہ جنگ ہو۔ اسی طرح امریکہ، اٹلی، بلجیم، برازیل اور کئی ایک اور جنوبی امریکہ کی حکومتوں نے ہندوستان کو یادداشتیں بھیج کر اپنی تشویش کا اظہار کیا۔ اس سے ہندوستان کو پتہ چلا کہ اگر وہ گوا پر چڑھ دوڑا تو نہ محض بین الاقوامی رائے اس کے خلاف ہو گی بلکہ پرتگال دوسری قوموں کی مدد سے اس کا مقابلہ کرے گا۔ اس سے ہندوستان کی بوکھلاہٹ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ پنڈت نہرو کو یقین تھا کہ ہند چینی میں انھوں نے جو پارٹ ادا کیا ہے اس کے پیش نظر ان کی بین الاقوامی پوزیشن مستحکم ہو گئی ہے۔ اور وہ اس کے زور پر پرتگال کو نیچا دکھا سکیں گے لیکن یہاں معاملہ الٹا ہو گیا۔ اور ہندوستان بین الاقوامی ہمدردیوں سے محروم ہوتا نظر آیا۔ اب پنڈت جی کی آنکھیں کھلیں اور انھوں نے دیکھا کہ ان کا معاملہ نہ تو حیدرآباد جیسے ہے کہ اس کی داد فریاد کوئی نہ سنے۔ نہ فرانس ہے کہ وہ ایک دھمکی میں اپنے مقبوضات سے دستکش ہو جائے اور نہ پاکستان ہے کہ وہ بیچارگی سے اقوام متحدہ کا منہ تکتا ہے۔ انھوں نے تمام متعلقہ اقوام کو تسلی دی کہ وہ جنگ کی طرح نہیں ڈالیں گے حالانکہ اگر وہ چاہیں تو فوجیں بھیج کر گوا پر قبضہ کر سکتے ہیں۔ البتہ وہ اہل گوا کو آزادی کی جدوجہد سے باز نہیں رکھ سکیں گے گو وہ ہندوستانیوں کو ایسا کرنے سے روکیں گے۔

اس پر پرتگال نے یہ تجویز پیش کی کہ وہ ہندوستان سے مل کر غیر جانبدار حکومتوں کے ایسے نمائندے منتخب کریں جو گوا اور ہندوستان کی سرحد پر موجود رہیں۔ اور حالات کا مشاہدہ کریں۔ ہندوستان نے اس تجویز میں یہ ترمیم کی کہ یہ مبصر گوا کی سرحد کے اندر رہیں اور ہندوستان کی سرحد میں نہ آئیں۔ اس لئے یہ تجویز قابل عمل نہ ہو سکی۔ ہندوستان کی ترمیم بلاوجہ نہ تھی۔ اس نے ہر طرف سے مایوس ہو کر گوا کے لئے "تحریک آزادی" شروع کرا دی تھی۔ گو یہ نام نہاد تحریک ہندوستان کی طرف سے شروع کی گئی تھی۔ اور اسے ہندوستانی فوج اور پولیس کی مدد مل رہی تھی تاہم بیرونی دنیا کو یہ بتانے کی ناکام کوشش کی گئی کہ اسے اہل گوا نے جاری کیا ہے۔ "آزاد گوا" تحریک کے جراثیم گوا کے اندر ضرور ملتے ہیں۔ ہندوستان کی تحریک آزادی کے دوران میں کانگریس عموماً اس علاقے میں مداخلت کرتی رہتی تھی۔ اس طرح ایک "گوان نیشنل کانگریس" بھی قائم ہو گئی تھی۔ ہندوستان اسے بطور شہادت پیش کرتا ہے کہ "آزاد گوا" کی تحریک پرانی ہے حالانکہ یہ طومار تازہ کھڑا کیا گیا ہے۔ اس تحریک کے سوا گوا پر وقتاً فوقتاً حملے کرتے رہتے ہیں اور پولیس وغیرہ کی نگرانی میں انھوں نے بعض دیہات پر قبضہ بھی کر لیا ہے۔ اس سے دونوں ممالک میں کشیدگی بڑھ گئی ہے۔ ہندوستان نے بھی تحریک کو تیز تر کر دیا۔ اور بڑے طمطراق سے اعلان ہونے لگا کہ ۱۵ اگست سنہ ۱۹۵۴ء کو یعنی ہندوستان کے یوم آزادی پر گوا پر یلغار کر دی جائے گی۔ گوا میں ہندوستان کے سفارتی نمائندے زمین کی تیاری میں مشغول تھے۔ پرتگال نے یہ دیکھ کر ہندوستان سے مطالبہ کیا کہ وہ انھیں واپس بلا لے۔ ہندوستان نے اس کے جواب میں بمبئی کے پرتگیزی قونصل خانے کے ارکان کو واپس کرنے کے لئے کہہ دیا۔ بہرحال کشیدگی بڑھتی گئی۔ پرتگال نے جرأت سے کام لیتے ہوئے اعلان کر دیا کہ وہ گوا کی پوری طرح مدافعت کریگا اس کے ساتھ ہی متعدد اقوام مغرب نے ہندوستان کو متنبہ کیا کہ وہ جنگ سے باز رہے چنانچہ ۱۵ اگست کی تاریخ آئی تو

(۱) ناٹو (NATO) NORTH ATLANTIC, TREATY ORGANIS- یعنی شمالی بحر اوقیانوس کی دفاعی تنظیم۔ اس میں امریکہ، برطانیہ، فرانس، ترکی اور دیگر اقوام مغربی یورپ شامل ہیں۔ جن کی تعداد پندرہ ہے

ہندوستانی ڈھول کا پول کھل گیا۔ نہ تو ہندوستان سے رضاکاروں کی کوئی قابلِ ذکر جماعت اکٹھی ہو سکی۔ نہ "مظلوم" اہلِ گوا ہی آمادہ بغاوت ہو سکے۔

یہ واضح رہے کہ گوا کی آزادی کے لئے جو "گوا لبریشن کونسل (GOA LIBERATION CONCIL) بنی اس نے اپنی طرف سے جو یادداشت شائع کی، اس میں یہ بیان کرتے ہوئے کہ گوا میں تحریکِ آزادی کہاں شروع ہوئی یہ اعتراف کیا گیا ہے کہ پرتگال کا سلوک گوا سے اتنا اچھا تھا کہ اہلِ گوا کو آزادی کا خیال بھی نہیں آیا (یہ قابلِ ذکر ہے کہ یادداشت میں اس اعتراف کا متن یہ کہہ کر چڑھایا گیا ہے کہ پہلے تو گوا سے حسنِ سلوک روا رکھا جاتا تھا لیکن اب حالات خراب ہو گئے ہیں) اس میں یہ بھی تسلیم کیا گیا ہے کہ اہلِ گوا نے کانگریس کی دعوت پر اس لئے لبیک نہیں کہی تھی کہ انہیں ڈر تھا کہ "آزادی" کی صورت میں وہ ہندوستان میں جذب ہو جائیں گے اور اپنا تشخص کھو بیٹھیں گے۔ اس اعتراف کے بعد کونسل کے دعویٰ آزادی اور ہندوستانی موقف کی قلعی کھل جاتی ہے۔

گوا سے متعلق پنڈت نہرو نے جس طرح پہلو بدلے ہیں وہ قابلِ غور ہیں اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ طاقت کے سامنے جھکتے ہیں۔ زبانی جمع خرچ کا ان پر کوئی اثر نہیں۔ گوا کے معاملہ میں جو کچھ ہوا ہے اس میں کشمیر کے لئے سامان عبرت ہے۔ کوئی ہے جو آنکھیں کھولے اور یہ سبق حاصل کرے۔

ماہنامہ طلوعِ اسلام کے پرانے پرچے

ماہنامہ طلوع اسلام کے جو پرانے پرچے دفتر میں موجود ہیں ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۹۴۹ء	اگست، ستمبر، نومبر، دسمبر
۱۹۵۰ء	نومبر
۱۹۵۱ء	مارچ تا نومبر
۱۹۵۲ء	اگست تا نومبر
۱۹۵۳ء	جنوری کے علاوہ سب
۱۹۵۴ء	پورے سال کے

یہ پرچے بزمہائے طلوع اسلام کو چوتھائی قیمت پر اور دیگر اصحاب کو آدھی قیمت پر دیئے جائیں گے۔

خواہشمند حضرات اپنی فرمائشیں جلد بھیجیں۔ ورنہ پرچے ختم ہو جانے کا احتمال ہے۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام - کراچی

مطبوعاتِ طلوعِ اسلام

معراجِ انسانیت از پرویز۔ سیرت صاحب قرآن علیہ التحیۃ والسلام کو قرآن کے آئینے میں دیکھنے کی پہلی اور کامیاب کوشش۔ مذاہبِ عالم کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر کے ساتھ ساتھ حضور سرورِ کائنات کی سیرت اور دین کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آگئے ہیں۔ بڑے سائز کے قریباً نو سو صفحات۔ اعلیٰ ولایتی گلیزڈ کاغذ، مضبوط و حسین جلد مع گرد پوش ——— قیمت - بیس روپے

ابلیس و آدم از پرویز۔ سلسلہ معارف القرآن کی دوسری جلد جسے نظرِ ثانی کے بعد شائع کیا گیا ہے۔ انسانی تخلیق قصۂ آدم۔ ابلیس۔ جنات۔ ملائکہ۔ وحی وغیرہ جیسے اہم مباحث کی حامل۔ بڑی تقطیع کے ۴۰۰ صفحات ——— قیمت ——— آٹھ روپے

قرآنی دستورِ پاکستان اس میں پاکستان کے لئے قرآنی دستور کا خاکہ دیا گیا ہے۔ اور حکومت علماء اور اسلامی جماعت کے مجوزہ دستوروں پر تنقید کی گئی ہے۔ دو سو چوبیس صفحات ——— قیمت دو روپے آٹھ آنے

اسلامی نظام اسلامی مملکت کے بنیادی اصول کیا ہیں۔ اور اسلامی نظام کیسے قائم ہو سکتا ہے؟ اس کے جواب میں پرویز اور علامہ اسلم جیراجپوری کے مقالات۔ جنہوں نے فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ ۱۸۰ صفحات ——— قیمت ——— دو روپے

سلیم کے نام از پرویز۔ نوجوانوں کے دل میں اسلام سے متعلق جو شکوک پیدا ہوتے ہیں۔ ان کا شگفتہ، مدلل اور اچھوتا جواب۔ بڑے سائز کے ۴۰۸ صفحات ——— قیمت چھ روپے

قرآنی فیصلے روزمرہ کی زندگی کے ساٹھ اہم مسائل و معاملات پر قرآن کی روشنی میں بحث۔ ۴۰۰ صفحات قیمت ——— چار روپے

اسبابِ زوالِ امت از پرویز۔ مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ میں پہلی مرتبہ بتایا گیا ہے کہ ہمارا مرض کیا ہے اور علاج کیا؟ ایک سو اڑتالیس صفحات ——— قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

جشن نامے ایسے عنوانات جنہیں پڑھ کر ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی ہو اور آنکھوں میں آنسو۔ طنز اور تنقید کے گہرے نشتر ساتِ سالہ دورِ آزادی کی سمٹی ہوئی تاریخ۔ ۲۵۶ صفحات ——— قیمت دو روپے آٹھ آنے

مزاج شناسِ رسول کون بتائے کہ صحیح احادیث کونسی ہیں اور غلط کونسی؟ مزاج شناسِ رسول! مزاج شناس کون ہیں؟ اس کی تفصیل اس کتاب میں ملے گی۔ ۴۴۰ صفحات۔ قیمت ——— چار روپے

مقامِ حدیث حدیث کے متعلق تمام اہم سوالات کے تفصیلی جواب۔ احادیث کے متعلق اتنی معلومات کسی جگہ یکجا نہیں ملیں گی۔ دو جلدیں ہر جلد کے قریباً چار سو صفحات اور قیمت فی جلد ——— چار روپے

فردوسِ گم گشتہ از پرویز۔ ان مضامین کا مجموعہ جنہوں نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نگاہ کا زاویہ بدل دیا۔ خالص ادبی نقطۂ نگاہ سے اردو لٹریچر کی بلند پایہ تصنیف۔ ۴۱۲ صفحات ——— قیمت چھ روپے

نوادرات از علامہ اسلم جیراجپوری

علامہ موصوف کے مضامین کا نادر مجموعہ۔ چار سو صفحات ——— قیمت چار روپے

اسلامی معاشرت از پرویز۔ مسلمان کے عادات و اخلاق کا خاکہ۔ رہنے سہنے کے ڈھنگ۔ سرکاری ملازمین کے فرائض و واجبات۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ہر اسلوب قرآنی آئینہ میں۔ صفحات ۱۹۲ ——— قیمت دو روپے

نظامِ ربوبیت از پرویز۔ انسان کے معاشی مسائل کا قرآنی حل اور ذاتی ملکیت کا قرآنی تصور۔ دورِ حاضرہ کی عظیم کتاب۔ ضخامت تین سو صفحے۔

قیمت قسم اول ——— چھ روپے قسم دوم ——— (غیر مجلد) ——— چار روپے

اقبال اور قرآن از پرویز۔ علامہ اقبال کے قرآنی پیغام سے متعلق محترم پرویز صاحب کے انقلاب آفریں مقالات کا مجموعہ۔ ڈسٹ کور کے ساتھ۔ صفحات ۲۵۶ قیمت دو روپے

تمام کتابیں مجلد ہیں اور گرد پوش سے آراستہ۔ محصول ڈاک ہر حالت میں بذمہ خریدار

ملنے کا پتہ:۔ ادارہ طلوع اسلام - پوسٹ بکس نمبر ۴۳۱۳ - کراچی

جاوید پریس میکلوڈ روڈ کراچی

اندرونِ ہند

جمعیۃ علماء مغربی بنگال نے حال ہی میں صوبے کے وزیر اعلیٰ کو ایک یادداشت پیش کی ہے جس میں یہ درخواست کی گئی ہے کہ وہ جمعیۃ کے ایک وفد کو ملاقات کا موقع دیں۔ تاکہ یادداشت کے مندرجات پر تفصیل سے گفتگو کی جاسکے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ مسلمانوں کا اقلیتی فرقہ حکومت کا وفادار ہے۔ لیکن بار بار توجہ دلانے کے باوجود حکام نے ان کی شکایات کے ازالہ کی کوئی کوشش نہیں کی۔ وزیر اعلیٰ سے اپیل یہ کی گئی ہے کہ

آپ اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق کوئی ایسا قدم اٹھایئے جو مساجد اور جائدادوں کی بحالی، مکانات کی واپسی اور تعمیر و مرمت کے کاموں میں معاون ثابت ہو۔ نیز بے گھر مسلمانوں کو مالی مدد دی جائے۔ تاکہ وہ اپنے قدموں پر کھڑے ہوسکیں۔ اور مذہبی مقامات کو بےحرمتی سے بچانے کے لئے متولیوں کے حوالے کیا جائے۔

معاصر "الجمعیۃ" دہلی یادداشت مذکورہ کا پس منظر بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے :۔

مغربی بنگال میں ۱۹۵۰ء میں جو خونی ہنگامہ ہوا۔ اس کے نتیجے میں ہزاروں مسلمان گھروں سے بے گھر ہوگئے ایک بڑی تعداد مشرقی پاکستان میں چلی گئی اور باقی مغربی بنگال میں ہی رہ گئی۔ دوسری طرف مشرقی پاکستان سے جو ہندو بھاگ کر مغربی بنگال آئے۔ وہ مسلمانوں کی جائداد پر قابض ہو بیٹھے۔ پھر دونوں حکومتوں میں یہ بات طے پائی کہ جو لوگ ہنگامے کے دوران میں مغربی بنگال سے مشرقی بنگال چلے گئے ہیں۔ وہ اگر واپس آنا چاہیں تو ان کی جائدادیں انھیں واپس کردی جائیں گی۔ اس طرح جو لوگ مشرقی بنگال سے مغربی بنگال چلے آئے۔ وہ بھی اگر واپس جانا چاہیں تو ان کی جائدادیں انھیں واپس کردی جائیں گی۔ چنانچہ اس معاہدے کے پیش نظر مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد مغربی بنگال واپس چلی آئی۔ اور بہت سے ہندو بھی مشرقی بنگال چلے گئے۔ مگر ان کی جو تعداد مغربی بنگال میں رہ گئی۔ اس نے مسلمانوں کی جائدادوں پر قبضہ کرلیا۔ اور جو مسلمان مشرقی بنگال سے واپس آئے وہ اپنی جائدادوں سے محروم رہ گئے۔ اور آج بھی جب کہ اس ہنگامہ کو گزرے ہوئے پانچ سال ہو چکے ہیں۔ مشرقی بنگال سے آنے والے پناہ گزیں (ہندو) مسلمانوں کی جائیدادوں کے مالک بنے بیٹھے ہیں اور مسلمان گھر سے بے گھر ہو کر دربدر مارے پھر رہے ہیں یادداشت میں ایسے بے خانماں اور بے گھر مسلمانوں کی تعداد سات لاکھ بتائی گئی ہے۔ گویا یوں سمجھئے کہ جو مسلمان مغربی بنگال سے گئے۔ ان کے مکانات اور زمینوں پر مشرقی بنگال سے آنے والے پناہ گزیں قابض ہو بیٹھے مگر جب مسلمان معاہدے کے مطابق مغربی بنگال آئے تو انھوں نے اپنے مکانوں میں دوسروں کو مقیم دیکھا اور وہ ہزار کوشش کے باوجود اپنے مکانوں کو پناہ گزینوں سے خالی نہ کراسکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خود مغربی بنگال کے مسلمان تو آج تک در در کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں اور دوسرے ملک یعنی (مشرقی بنگال) سے آئے ہوئے ہندو ان کے مکانوں میں موج کر رہے ہیں"

اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے معاصر موصوف لکھتا ہے :۔

اس کی وجہ وہ قانون ہے جو ۱۹۵۱ء میں مغربی بنگال ایکٹ ۱۶ کے نام سے نافذ کیا گیا ہے۔ اس قانون کا منشا یہ ہے کہ جب تک مشرقی بنگال سے آئے ہوئے ہندوؤں کے ایک ایک فرد کو (جو ناجائز طور پر مسلمانوں کی جائداد پر قابض ہیں) بسایا نہیں جائے گا۔ اس وقت تک ان سے مسلمانوں کے گھروں کو خالی نہیں کرایا جاسکتا۔ حیرت ہے کہ آنے والے مہاجروں کا خیال تو اس قدر رکھا گیا کہ ان کا کوئی فرد بے گھر نہ رہنے پائے۔ لیکن جو مسلمان صوبے کے اصل باشندے تھے۔ وہ اپنی جائداد کی موجودگی میں در در کی ٹھوکریں کھاتے پھریں۔ پانچ سال سے قبضہ اور بساؤ کا یہی چکر چل رہا ہے۔ اصل مالک روٹیوں تک سے محتاج ہیں۔ اور مہمان عزیزان کے گھروں میں پاؤں پھیلا کر آرام سے سو رہے ہیں (اس کے باوجود) ذمہ دار لوگ یہ کہتے نہیں تھکتے کہ مسلمانوں کو کبھی کا بسایا جاچکا ہے"۔

یہ یادداشت تیار ہو رہی تھی کہ لندن کے لئے روانہ ہونے سے قبل مولانا ابوالکلام آزاد وزیر تعلیم حکومت ہند نے بمبئی میں کہا :۔

"مختلف اسباب کی بناپر ادھر سات آٹھ سال میں جو حالات ملک کے اندر رونما ہوئے اور جو مصائب اور مشکل مسائل سامنے آئے۔ ان کا نہایت پامردی اور استقلال سے مقابلہ کیا گیا۔ الحمد للہ بہت بڑی حد تک حالات پر قابو پا لیا گیا ہے۔ مسلمانوں کو اپنے مستقبل سے قطعاً مایوس نہیں ہو کر اپنی سیاسی اور مذہبی خفتہ صلاحیتوں کو بیدار کرنا چاہیئے۔ اگرچہ زندگی کے بعض گوشوں میں ابھی کچھ کانٹوں کی چبھن باقی ہے۔ مگر انہیں اطمینان رکھنا چاہیئے کہ یہ کانٹے بھی عنقریب صاف ہوجائیں گے۔ اور زندگی کے تمام شعبوں میں چین اور اطمینان نصیب ہوگا۔"

جمعیۃ علمائے مغربی بنگال کی محولہ بالا یادداشت کی ایک مثال ہی سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ زندگی کے کن کن گوشوں میں ابھی تک کون کون سے کانٹوں کی چبھن باقی ہے۔ اور جن کے سینوں میں یہ کانٹے پیوست ہیں وہ کہاں تک اطمینان رکھ سکتے ہیں کہ "عنقریب" یہ کانٹے بھی صاف ہوجائیں گے۔

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کانپور کا اخبار "ہماری آواز" لکھتا ہے :۔

"حضرت مولانا نے یہ بات جس انداز سے کہی ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مقابلہ کرنا اور قابو پانا ان کی ذات گرامی یا جمعیۃ علماء کا کارنامہ ہے۔ حالانکہ دیکھنے والے جانتے ہیں کہ ایسا نزدیک و دور بھی نہیں۔ اگر اس صاف گوئی کو گراں نہ متصور کیا جائے تو امر واقعہ یہ ہے کہ جو تباہ کن مصائب اور مشکل مسائل سات آٹھ سال دور میں مسلمانوں کے سر پڑے۔ ان میں شدت، ڈھٹائی اور بے باکی کا اظہار اسی باعث حد سے زیادہ ہوا کہ مولانا اور رفقاء حکومت کے چند عہدے لئے بیٹھے رہے اور ہر ظلم و ستم اور ہر ناانصافی اور حق تلفی کو خود بخود ان کی قبولیت اور پسند کی سند ملتی رہی۔ مثال کے طور پر حیدرآباد کے پولیس ایکشن کو لیجئے۔ قاسم رضوی اور ان کے رضاکاروں کی سرکوبی ہزار بار جائز سہی۔ لیکن اس کا دائرہ جو لاکھوں عام مسلمانوں تک وسیع ہوا اور اس کے آج تک تباہ کن اثرات باقی ہیں۔ کیا اس کی ذمہ داری سے مولانا اور جمعیۃ علماء بری ہیں؟ ان کی تائید اور مکمل یقین دہانی کے بغیر حکومت اس اقدام کی جرأت ہی نہ کرتی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس ایکشن کے ریلے میں ایک قوم نے دوسری قوم کو ایسا پیس کے رکھ دیا کہ اگر صدیوں میں اصلاح ہو جائے تو آج ہوئی۔ اس سلسلہ کی دوسری مثال لیجئے۔ حضرت مولانا کے مرکزی وزیر تعلیم اور کابینہ کے اہم رکن ہوتے ہوئے کانگریس نے "ہندوستانی" زبان کے قدیم موقف سے اس لئے روگردانی کی کہ اردو کو سرکاری زبان کی حیثیت نہ ملے، چنانچہ "ہندی" سرکاری زبان بن گئی۔ اور پھر سارے ملک میں اردو پر جھاڑو پھیر دی گئی۔ ۔۔۔۔ مگر مولانا اور ان کے ہم خیال بدستور اردو کش حکومت کے ساتھ ہیں۔ اگر یہ سمجھا جائے کہ یہ سب کچھ ان کی حمایت و تائید سے ہو رہا ہے؟ تو اس میں کیا غلط ہوگا؟

رہ گیا مسلمانوں کا مستقبل اور چبھے ہوئے کانٹوں کی صفائی تو انشاء اللہ وقت آنے پر کانٹوں کی صفائی کے ساتھ مستقبل بھی لائق اطمینان سامنے آجائے گا۔ اس کے لئے قدرت ایسے آدمی پیدا کرے گی جو ابن الوقت اور جی حضوری نہ ہوں گے۔ اور جرأت کے ساتھ حکومت کو غلط روی سے باز رکھنے پر قادر ہوں گے"۔

معاصر "مدینہ" جسے مولانا کا احترام پوری طرح ملحوظ ہے۔ اس پر یوں تبصرہ کرتا ہے :۔

"مسلمانوں کی ساری بدقسمتی یہ ہے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد سے ان کا ملی شیرازہ منتشر ہوچکا ہے۔ اس کو یکجا کرنے کے لئے جیسے عظیم رہنما کی ضرورت تھی۔ وہ آج ہم میں

(باقی ص۱۸ کالم ۳ پر)

حقائق و عبر

تشتت و افتراق

ابھی پچھلے دنوں وزیر اعظم مسٹر محمد علی نے فرمایا تھا کہ مسلم لیگ اب بھی ملک میں مضبوط ترین اور موثر ترین جماعت ہے۔ صدر کی حیثیت سے اپنی جماعت سے وہ جتنا حسن ظن بھی قائم کریں کم ہے۔ لیکن ان کی مسلم لیگ نے مضبوط اور موثر ہونے کا جو مظاہرہ کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ذرا پشاور سے چلئے اور دیکھتے جایئے کہ مسلم لیگ کے صحرائے اعظم میں کون کون سے نخلستان نظر آتے ہیں۔ خان عبدالقیوم خاں کے نام نامی سے بچہ بچہ واقف ہے۔ تقسیم سے پہلے وہ کانگریس کو چھوڑ کر مسلم لیگ میں شامل ہو گئے تھے۔ تقسیم کے بعد وہ سرحدی مسلم لیگ کے صدر بھی ہو گئے۔ اور صوبہ کے وزیر اعلیٰ بھی۔ لیکن وقت یکساں نہیں رہتا۔ وہ صوبے سے بے دخل ہوئے اور مسلم لیگ کی صدارت سے بھی علیحدہ کر دیئے گئے۔ وہ بہرحال ہیں مسلم لیگی۔ اب جو مجلس دستور ساز کے انتخابات کا وقت آیا۔ تو انھوں نے سرحد سے مسلم لیگ کا ٹکٹ مانگا۔ ٹکٹ مرکزی پارلیمانی بورڈ کی طرف سے صوبائی بورڈ کی سفارش پر دیئے جاتے ہیں۔ لیکن آپ نے صوبائی بورڈ سے بالا بالا براہ راست مرکزی بورڈ کو درخواست دی۔ لیکن انھیں ٹکٹ نہیں دیا گیا۔ اس پر انھوں نے مسلم لیگ کو چھوڑ دیا۔ اور آزاد امیدوار کی حیثیت سے انتخاب لڑنے کا اعلان کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے مسلم لیگ میں وہ کیڑے نکالے کہ پتہ چلتا تھا کہ یہ جماعت ایسی ہے کہ کوئی شریف آدمی اس میں رہ نہیں سکتا تھا۔ اب وہ ہرچند مسلم لیگ سے باہر آگئے ہیں۔ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ کئی مسلم لیگی ان کو ووٹ دیں گے۔

پشاور سے لاہور آیئے یہاں پنجاب مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ کے صدر ملک فیروز خاں نون ہیں۔ لیکن چونکہ اب وہ وزیر اعلیٰ نہیں ہیں۔ اس لئے بورڈ کے ارکان نے ان کے بغیر اجلاس کر کے نامزدگیاں کر دیں۔ مرکزی بورڈ نے کم و بیش ان کی تصدیق کر دی۔ اور ملک نون اور ان کے ساتھیوں کو اس بنا پر ٹکٹ نہیں دیئے کہ وہ جماعتی ڈسپلن کا احترام نہیں کرتے۔ یہ فیصلہ ہوا تو مسلم لیگیوں نے دھڑا دھڑ کاغذات نامزدگی داخل کرنے شروع کر دیئے۔ پنجاب میں اب تین قسم کے مسلم لیگیوں نے کاغذات داخل کئے ہیں۔ قسم اول وہ ہیں جن کو سرکاری طور پر نامزد کیا گیا ہے۔ دوسری قسم ملک صاحب کے گروہ کی ہے وہ بھی اپنے آپ کو مسلم لیگی کہلاتے ہیں۔ تیسرا گروہ آزاد مسلم لیگیوں کا ہے۔ وہ بھی مسلم لیگی ہیں۔ لیکن نہ وہ سرکاری نامزدگان ہیں نہ وہ نون گروہ کے ساتھ ہیں۔

اب سندھ کا منظر دیکھئے۔ یہاں مسٹر کھوڑو وزیر اعلیٰ ہیں۔ اور وہی صوبائی پارلیمانی بورڈ کے صدر ہیں۔ لیکن انتخاب کا وقت آیا تو قاضی فضل اللہ صاحب نے دعویٰ باندھا کہ صوبائی پارلیمانی بورڈ کے صدر مسٹر کھوڑو نہیں بلکہ وہ ہیں۔ یہی نہیں بلکہ مسٹر کھوڑو اور قاضی صاحب دونوں نے امیدواروں سے درخواستیں طلب کیں اور دونوں نے اپنی اپنی سفارشات مرکزی بورڈ کو بھیج دیں۔ مرکزی بورڈ نے پنجاب میں تو تقریباً ایک ہی گروہ کو ٹکٹ دینے کی کوشش کی تھی۔ لیکن سندھ میں اس نے دوسرے گروہ کو بھی خوش کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ مسٹر کھوڑو کے تین امیدواروں کو ٹکٹ مل گئے۔ اور چوتھا ٹکٹ میر غلام علی خاں تالپور کو دے دیا گیا۔ میر صاحب مرکز میں وزیر بھی رہ چکے ہیں مرکزی وزیر ہونے کے باوجود آپ سندھی سیاست میں دخیل رہے اور کئی اہم معاملات میں انھوں نے مرکزی پالیسیوں کا ساتھ نہیں دیا گویا ایسی فضا موجود تھی کہ جس کی بنا پر ملک نون صاحب کو پنجاب میں ٹکٹ نہیں دیا گیا تھا اسی بنا پر انھیں بھی ٹکٹ نہ دیا جاتا۔ لیکن انھیں ٹکٹ مل گیا۔ مرکزی بورڈ نے جس کے صدر خود وزیر اعظم ہیں یہ اصولی نکتہ بھی حل نہ کیا کہ سندھ میں مسٹر کھوڑو کی مسلم لیگ قابل تسلیم ہے یا قاضی فضل اللہ کی۔ ویسے بورڈ نے ایک امیدوار مسٹر کھوڑو کی مخالف پارٹی کا لے کر دبی زبان سے یہ اعتراف کر لیا کہ ان کے نزدیک دونوں کی حیثیت مسلّم ہے۔ اب جو کاغذات نامزدگی داخل کرنے کا وقت آیا تو ان چار سرکاری مسلم لیگی نمائندوں کے علاوہ متعدد مسلم لیگیوں نے کاغذات داخل کر دیئے۔ ان میں ایک قاضی محمد اکبر بھی تھے جو مسٹر کھوڑو کی پارٹی کے ہیں۔ ایک مقامی اخبار کو مسٹر کھوڑو نے بتایا کہ قاضی اکبر کا اقدام ان کی ایماء پر ہوا ہے اور یہ جماعتی ڈسپلن کے منافی نہیں ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ٹکٹ دیتے وقت میر صاحب سے یہ طے ہوا تھا کہ ان کے علاوہ ان کی پارٹی کا اور کوئی امیدوار نہ ہوگا۔ لیکن عملاً اور کئی امیدوار پیدا ہو گئے۔ گویا میر صاحب نے معاہدے کی خلاف ورزی کی اور قاضی صاحب کے کاغذات اس کی صدائے بازگشت ہیں دوسرے مسلم لیگیوں کا کہنا ہے کہ میر صاحب نے خفیہ معاہدہ کیا یا نہیں اس کا انہیں علم نہیں۔ اور کیا تو وہ اس کی پابندی کے مکلف نہیں۔

یہ کچھ تو صوبوں میں ہو رہا ہے۔ مرکز کی حالت یہ ہے کہ مرکزی بورڈ کے ایک رکن میر بلخ شیر خاں مزاری نے پنجاب میں اپنے کاغذات نامزدگی داخل کر دیئے ہیں۔ آپ ٹکٹ حاصل نہیں کر سکے تھے لیکن پارٹی ڈسپلن کا لحاظ کئے بغیر امیدوار کھڑے ہو گئے یہ اجمالی سا نقشہ ہے اس افراتفری کا۔ جو ملک کی مضبوط ترین اور موثر ترین جماعت" میں پھیلی ہوئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ پارٹی ڈسپلن کمزور ہے۔ لیکن یہ ایسا ہی ہے جیسے یہ کہا جائے کہ فلاں شخص بیمار اس لئے ہے کہ اس کی صحت ٹھیک نہیں۔ نہ یہ مرض کی تشخیص ہے۔ نہ اس کا مداوا۔ چنانچہ وزیر اعظم نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ وہ ہر اس رکن کے خلاف تادیبی کارروائی کریں گے۔ جس نے جماعتی نظم کی مخالفت کی ہے۔ یہ ٹھیک ہے لیکن ڈسپلن ایک منظم اور فعال جماعت کا ہو سکتا ہے مردہ جماعت کا نہیں۔ اور جماعت کی زندگی اس وقت ممکن ہو سکتی ہے کہ متعین مقاصد پیش نظر ہوں اور ان کا کما حقہ شعور موجود ہو۔ جہاں تک ملی مقاصد کا تعلق ہے ان کا شعور پارٹی کے تنگ نظرانہ نقطۂ نگاہ سے پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ معاملات کو ملی نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے نہ کہ پارٹی کے نقطۂ نگاہ سے۔ بالفاظ صحیح تر ملت کو بھی ذاتہ ایک پارٹی سمجھنا چاہیئے اس میں مزید پارٹیاں اور تشتت و افتراق کی مردود کوششیں نہیں کرنی چاہئیں۔ مشکلات کا حل پارٹیوں کے خاتمے اور ملی شعور کی بیداری میں ہے۔ ہمارے ہاں پارٹیاں عملاً ختم ہو چکی ہیں۔ ہمیں کرنا صرف یہ ہے کہ اس حقیقت کا اعتراف کر لیں کہ وہ ختم ہو گئی ہیں اور اب ملت میں مزید تفرقہ پیدا نہیں کیا جائیگا۔

اندرون ہند

(ص ۱۴ سے آگے)

موجود نہیں ہے۔ ہاں درد اور تڑپ رکھنے والے کچھ لوگ ضرور موجود ہیں۔ جو اپنی سی کوشش کئے جا رہے ہیں۔ لیکن ان سب کا ذہنی سطح پر ایک ہونا بھی تو ضروری ہے"۔

"ہماری آواز" اور "مدینہ" دونوں کے تبصروں سے یہ حقیقت بخوبی سامنے آجاتی ہے کہ مسلمانان ہند کو جس قیادت کی ضرورت تھی۔ وہ انھیں میسر نہیں آسکی۔ اور جو قائدین میدان میں تھے انھوں نے سرے قوم آنے کی بجائے حکومت اور کانگریس کی خوشامد کر کے ذاتی مناصب کے حصول پر توجہ دینے کو مقدم سمجھا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ قوم یتیم ہو گئی۔ اور اس کا پرسان حال کوئی نہ رہا جس کشتی کا ملاح کوئی نہ ہو۔ اور وہ طوفانوں میں گھر جائے۔ اس کا جو حشر ہو سکتا ہے۔ اس کا تصور مشکل نہیں۔ مسلمانان ہند کے ساتھ یہی ہوا۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ وہ اب بھی ان قائدین کی طرف دیکھ رہے ہیں جنھوں نے عظیم الشان ابتلاؤں میں ان کا ساتھ دینا شخصی مصالح کے منافی سمجھا تھا۔ وقت آگیا ہے کہ مسلمان گردوپیش کا جائزہ لیں اور بدلے ہوئے حالات میں اپنی جگہ پیدا کریں۔ اگر انھوں نے ژرف نگاہی سے کام لیا اور حقائق کو برائی العین دیکھا۔ تو ایسی قیادت ان کے اندر سے ہی ابھر سکتی ہے جس کے فقدان سے وہ مبتلائے آلام و محن چلے آرہے ہیں۔

۱۹ر مارچ ۱۹۵۵ء کا طلوع اسلام ادارہ کے پاس بالکل ختم ہو گیا ہے۔ اگر کسی صاحب کے پاس یہ پرچہ فالتو ہو تو ادارہ اسے قیمتاً لے لیگا۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام کراچی

بین الاقوامی جائزہ

روس نے چوٹی کی کانفرنس کی مغربی تجویز قبول کرکے عالمی توجہات کو جنیوا پر مرکوز کردیا ہے۔ یہ کانفرنس صدر امریکہ اور وزرائے اعظم برطانیہ، فرانس اور روس کے مابین ہوگی۔ روس کی تجویز یہ تھی کہ اس کا انعقاد وی آنا میں ہو لیکن مغربی تجویز یہ تھی کہ کانفرنس جنیوا میں ۱۸ جولائی سے شروع ہو۔ اس کانفرنس کے لئے کوئی طے شدہ ایجنڈا مرتب نہیں کیا جائیگا بلکہ عمومی امور کو زیر بحث لاکر تفاصیل کے تعین کے لئے وزرائے خارجہ کے سپرد کر دیا جائیگا۔ گو امریکہ کی کوشش یہ ہے کہ جنیوا کی کانفرنس امور یورپ تک محدود رہے۔ لیکن برطانیہ اور فرانس مشرق بعید کو بھی زیر بحث لانا چاہتے ہیں۔ ویسے یہ امر قرین قیاس نظر نہیں آتا کہ دول اربعہ کے اعلیٰ قائدین مل بیٹھیں اور مشرق بعید کا معاملہ سامنے نہ آئے۔ امریکہ مشرق بعید کو کانفرنس کے دائرہ بحث سے باہر رکھنا چاہتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا خیال یہ ہوگیا ہے کہ چین سے متعلق معاملات کو براہ راست مذاکرات سے سلجھائے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوسکتا ہے کہ نیشنلسٹ چین کو بالواسطہ یا بلاواسطہ ان سے متعلق کرلیا جائے۔ بہرحال قیاس یہی ہے کہ تمام عالمی مسائل پر بحث و تمحیص ہوگی البتہ بعض مستثنیات ضرور ہوں گی مثلاً اقوام مغرب نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ وہ ناٹو، دفاعی تنظیموں وحدت یورپ وغیرہ مسائل کو بحث کا مدار نہیں بننے دیں گے اسی طرح روس نے بھی یہ شرط لگادی ہے کہ وہ مشرقی یورپ کے کمیونسٹ ممالک کے معاملات اور "بین الاقوامی کمیونزم" کی سرگرمیوں کو زیر بحث نہیں لانے دیگا۔ روس کی مخالفت کی وجہ یہ ہے کہ اس نے غیر جانبدار ممالک کا سلسلہ قائم کرنے کی جو طرح ڈالی ہے تو امریکہ نے اس کے جواب میں اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ روس کے حلقہ بگوش ممالک کو بھی یہ موقع ملنا چاہئے کہ وہ فیصلہ کریں کہ وہ روس کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں یا غیر جانبدار بننا چاہتے ہیں۔ اشتراکی ممالک کا معاملہ عالمی قائدین کے روبرو پیش ہو یا نہ ہو وہ ایک گونہ دلچسپی کا حامل ضرور ہے۔ یہ یقیناً امر واقعہ نہیں کہ یہ ممالک بہ طیب خاطر روس کے حلقہ بگوش ہیں بلکہ وہ زبردست فوجی آمریت میں مبتلا ہیں اور ان کے ہاں ایسے افراد برسر اقتدار ہیں جنہیں ماسکو نے اپنے مفاد کے لئے آلہ کار کے طور پر آگے بڑھا رکھا ہے۔ گو روس کی عسکری گرفت بڑی آہنی ہے اور اس آہنی پردے کے پیچھے جو کچھ ہو رہا ہے اس کا صحیح اندازہ بہت کم بیرونی دنیا کو ہوتا ہے لیکن وقتاً فوقتاً جو خبریں اس پردے کو چیر کر نکل آتی ہیں ان سے یہ استنباط کرنا مشکل ہے کہ وہاں بالکل خیریت ہے۔ سال گذشتہ مشرقی برلن میں ۱۷ جون کو وسیع پیمانے پر خلاف اشتراکیت مظاہرے ہوئے تھے جو بعد کو اور جگہوں میں بھی پھیل گئے تھے۔ اس سال ان مظاہروں کی سالگرہ منائی گئی جو اس بات کا ثبوت ہے کہ جذبات بغاوت بالکل فرو نہیں ہوگئے فرو ہونا تو ایک طرف ہو سکتا ہے کہ ان جذبات کو اور ہوا ملے روس نے جس بھونڈے طریق سے مارشل ٹیٹو کی خوشامد کی ہے اس کا اثر لامحالہ مشرقی ممالک پر پڑیگا۔ مارشل ٹیٹو کو اسلئے راندہ درگاہ قرار دے دیا گیا تھا کہ وہ ماسکو کی مکمل اطاعت کے حق میں نہیں تھے۔ اب روسی قائدین الٹے بلگریڈ جاکر گویا یہ تسلیم کرلیا ہے کہ مارشل ٹیٹو کو ماسکو سے مختلف اپنے انداز کی سوشلزم رائج کرنے کا حق حاصل ہے۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ جو حق ٹیٹو کو دیا گیا ہے وہ دوسرے ممالک کو بھی ملیگا؟ یعنی بالفاظ صحیح تر کیا روس کے زیر نگیں ممالک کو یہ اجازت دی جائے گی کہ وہ بھی ماسکو برانڈ کی کمیونزم کی بجائے قومی سوشلزم کا تصور قائم کریں اور اپنے حالات و مقتضیات کے مطابق روسی قالب میں تبدیلیاں کرلیں؟ یہ سوال بڑا بنیادی ہے۔ بظاہر نہیں کہا جاسکتا کہ روس اس قسم کی اجازت دے کر کمیونزم کی سلطنت کو ٹکڑے ٹکڑے ہوجانے دے گا۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی گرفت اور مضبوط کرے اور علیحدگی یا بغاوت کے جذبات کو پھیلنے نہ دے۔ لیکن اس سے زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ یہ باغیانہ خیالات مستقبل قریب میں لباس حقیقت و عمل نہ پہن سکیں لیکن رفتہ رفتہ ذہنیتوں میں تبدیلیاں پیدا کرتے رہیں گے اور ہو سکتا ہے کہ اندر اندر پکنے والا مواد کسی وقت اچانک پھوٹ پڑے۔ لہٰذا گو فوری نتائج کی توقع نہیں رکھنی چاہئے۔ لیکن ان رجحانات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

اس سلسلہ میں چین کا مسئلہ بھی قابل مطالعہ ہے چین اشتراکی سہی لیکن یہ تسلیم کرنا مشکل ہے کہ وہ روس کا حلقہ بگوش بچہ یا بن جائے گا۔ وہ رفتہ رفتہ قومی سوشلزم کا ہی تصور پیدا کرے گا اور گو لمبے عرصے تک چین اور روس کے مفادات سطحی طور پر مشترک ہوں گے اور ان میں پھوٹ کا سوال پیدا نہیں ہوگا لیکن عین ممکن ہے کہ مستقبل بعید میں روس اور چین سلطنت اشتراکیت کے دو معاون و ہم آہنگ حصے نہ رہ سکیں۔ یوں بھی خود چین کے اندر بغاوت کے آثار پائے جاتے ہیں۔ گذشتہ ہفتے پیکنگ ریڈیو نے یہ انکشاف کیا کہ وسطی چین میں کارکن گرفتار کئے گئے ہیں جو تہ خانوں میں کام کرتے تھے ان کا مقصد موجودہ اشتراکی حکومت کا تختہ الٹ کر ملوکیت کا قیام تھا۔ چنانچہ ایسے کئی رضاکاروں کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا ہے۔ یہ باور کرنا مشکل ہے کہ ایک ایک کارکن کو گرفتار کرکے ٹھکانے لگا دیا گیا ہے۔ اس سے توقع کی جاسکتی ہے کہ بغاوت کے جراثیم اندر اندر پرورش پاتے رہیں گے۔ اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اس کے متعلق قیاس آرائی قبل از وقت ہے۔

مغربی جرمنی کے چانسلر ڈاکٹر ایڈی نار کو روس نے ماسکو آنے کی جو دعوت دی ہے اس کے خدوخال واضح تر ہوتے جارہے ہیں۔ ڈاکٹر ایڈی نار نے صاف طور پر کہہ دیا تھا کہ وہ اقوام مغرب سے اتحاد کی پالیسی سے دستکش نہیں ہونگے چنانچہ وہ امریکہ میں امریکی، برطانوی اور فرانسیسی وزرائے خارجہ سے ملاقات کرکے اپنا موقف طے کر آئے ہیں ان کی کوشش ایک طرف یہ ہے کہ مغرب کے حلیف رہیں اور اسلحہ بندی کا جو فیصلہ ہو چکا ہے اس کا فائدہ اٹھائیں۔ دوسری طرف وہ یہ چاہتے ہیں کہ روس سے ایسا تصفیہ ضرور ہوجائے کہ وحدت جرمنی کی صورت پیدا ہوجائے۔ چنانچہ ان کا خیال یہ نظر آتا ہے کہ وہ تحدید اسلحہ کے کسی ایسے قابل عمل فارمولے کو جانبین سے منوائیں جس سے عالمی کشیدگی کم ہو اور وحدت کے امکانات روشن ہوجائیں۔ انھوں نے یہ بھی اعلان کیا کہ وہ ماسکو جانے سے پہلے روس سے یہ وعدہ لیں گے کہ وہ جرمن جنگی قیدیوں کو رہا کردیگا۔

چونکہ ڈاکٹر ایڈی نار قائدین اعلیٰ کی چوٹی کی کانفرنس کے بعد ماسکو جائیں گے اس لئے توقع کی جاسکتی ہے کہ روس اس کانفرنس میں اپنی امن پسندی کا ایسا ثبوت دنیا ضروری سمجھیگا جس سے مغربی جرمنی میں یہ امید بیدار تر ہوجائے کہ روس سے مصالحت ممکن ہے لہٰذا پہلے اس صورت کو اچھی طرح آزما کے دیکھ لیا جائے۔ اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ روس کا رویہ کانفرنس میں کیا ہوگا۔ بعض حلقوں میں قیاس آرائی ہو رہی ہے کہ شائد روس یہ ثبوت دینے کے لئے کہ وہ دوسرے ممالک میں مداخلت کا قائل نہیں کمنفارم (cominform) کو بھی ختم کردے۔ ایسا کرکے وہ اقوام مغرب کے دل میں یہ خیال پیدا کرنا چاہیگا کہ وہ ان سے ہر طرح کے تعاون کے لئے آمادہ ہے۔ کمنفارم کمیونسٹوں کے پروپیگنڈے کا شعبہ ہے اور اس کا مقصد تمام ممالک کی کمیونسٹ پارٹیوں کے پروگرام میں مطابقت پیدا کرنا ہے ابتداً اس شعبے کا نام کمنٹرن (comin Tern) تھا لیکن جنگ کے دوران میں ایسے ہی مقاصد کے تحت اسے کمنفارم سے بدل دیا گیا تھا اس نئے شعبہ کا دفتر پہلے بلگریڈ میں تھا اور جب مارشل ٹیٹو باغی ہوگئے تو اسے بخارسٹ (ہنگری) میں منتقل کردیا گیا۔

فارموسا سے متعلق ابھی تک پس پردہ مذاکرات ہو رہے ہیں گو یہ خبریں آرہی ہیں کہ چین اور امریکہ دونوں تیاریوں میں مصروف ہیں چین حملے کی تیاریاں کررہا ہے اور امریکہ مدافعتی تدابیر میں منہمک ہے چونکہ جنیوا کانفرنس میں بھی فارموسا کا سوال ضرور اٹھیگا اسلئے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ ان تیاریوں کے باوجود صورت حال جلدی نہیں بگڑے گی۔

مشرقی پنجاب میں سکھوں کا مورچہ بدستور جاری ہے۔ یہ مورچہ پنجابی صوبے کیلئے نعرے لگانیکا حق حاصل کرنے کے لئے شروع کیا گیا ہے اب تک پانچ ہزار سے زائد سکھ گرفتار ہوچکے ہیں صوبائی وزیر اعلیٰ لالہ بھیم سین سچر نے ان دنوں کہا ہے کہ ان کے جیلوں میں ابھی بہت جگہ پڑی ہے اس لئے وہ سکھوں کے سامنے جھکیں گے نہیں۔ اسکے جواب میں سکھوں نے کہا ہے کہ وہ جیل بھر دیں گے

(باقی صفحہ ۱۸ پر)

عالمِ اسلامی

داخلی آزادی کے سمجھوتے نے ٹیونس میں امن وسکون کی فضا پیدا کردی ہے۔ پچھلے دنوں ٹیونس کے قائد حبیب بورقیبہ تین سال کی نظربندی کے بعد وطن واپس آئے تو ان کا بڑا گرمجوشانہ استقبال کیا گیا۔ لیکن اہل ٹیونس نے جس نظم وضبط کا مظاہرہ کیا اس نے فرانس کے اس متشدد طبقے کو لاجواب کردیا ہے جس کا سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ اگر مسلمانوں کو اختیارات سونپ دیئے گئے تو فرانس کے مفادات غیر محفوظ ہوجائیں گے۔ ٹیونس کے تصفیہ نے البتہ دوسرے حصوں میں بہت ہلچل مچادی ہے۔ الجزائر میں وطن پرستوں کا زور مشرقی حصے میں ہے۔ وہاں فرانسیسیوں کے زرعی فارم باقاعدہ قلعوں میں بدل گئے ہیں۔ اور وہ لوگ گورنر جنرل سے مطالبہ کررہے ہیں کہ انھیں وطن پرستوں کو جواب دینے کی اجازت دی جائے۔ مراقش میں تو فرانسیسی آبادکاروں نے قانون اپنے ہاتھ میں لے ہی لیا ہے۔ اور انھوں نے "جوابی کارروائی" شروع کردی ہے۔ انھوں نے ایک نامور فرانسیسی تاجر کو قتل کردیا ہے؟ کیونکہ وہ اعتدال کی راہ اختیار کرنے کے حق میں تھا۔ عجیب اتفاق ہے کہ اب فرانسیسی آبادکاروں میں ایسا طبقہ پیدا ہوتا جارہا ہے جو مطالبہ آزادی کا ہمدرد ہے۔ اگر یہ طبقہ زور پکڑ گیا۔ تو خود فرانسیسیوں میں خانہ جنگی شروع ہوسکتی ہے۔

الجزائر کے آزادی پسندوں نے ایک حالیہ کنونشن میں اس پر اظہار افسوس کیا ہے کہ ٹیونس نے فرانس سے علیحدہ معاہدہ کرلیا ہے۔ حالانکہ یہ تینوں ممالک مطالبہ آزادی میں متفق ہیں۔ انھوں نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ سارے علاقہ کو آزاد کرانے کے لئے ایک مشترکہ محاذ بنایا جائے۔ اس تجویز کی معقولیت میں کوئی شبہ نہیں۔ اگر تینوں ممالک کے آزادی پسند ایک دوسرے کے معاون و مددگار ہوجائیں تو آزادی کی منزل قریب تر ہوجائیگی

مغرب اقصیٰ میں جو صورت حال پیدا ہورہی ہے وہ فرانس کے نزدیک خوش آئند نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ فرانس نے یہ خدشہ محسوس کرنا شروع کردیا ہے کہ مغرب اقصیٰ ایک دوسرا ہند چینی بن جائے گا۔ اور اسے بیک بینی و دو گوش وہاں سے نکلنا پڑے گا۔ لیکن فرانس نے ہند چینی کی مثال سے کوئی عبرت حاصل نہیں کی۔ وہ بدستور تشدد اور دباؤ کی باتیں کررہا ہے چنانچہ وہ رفتہ رفتہ اپنی فوجیں ناٹو کی تحویل سے نکال کر شمالی افریقہ بھیج رہا ہے یہ شکل امریکہ کو پسند نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ اس سے ناٹو کی دفاعی حیثیت مخدوش ہوجاتی ہے۔ غالباً اسے دیکھ کر فرانس نے امریکہ پر الزام لگایا ہے کہ وہ اس سے تعاون نہیں کررہا ہے۔ اور مغرب اقصیٰ کو ناٹو کے زیر اثر بھی نہیں رہا۔ امریکہ کو یقین دلانے کے لئے کہ وہ مغرب اقصیٰ سے دستبردار ہونے کے لئے تیار نہیں فرانس نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ مغرب اقصیٰ غیر ملک نہیں بلکہ فرانس کا ناقابل تقسیم حصہ ہے۔ اس نے امریکہ کو یہ کہہ کر بھی مداخلت سے باز رکھنے کی کوشش کی ہے کہ فرانس امریکہ کے حلقہ ہائے اثر کا احترام کرتا ہے۔ اور ان میں مداخلت نہیں کرتا لہٰذا امریکہ کو بھی فرانسیسی مفادات کا تحفظ کرنا چاہیئے فرانس الجزائر کو اپنے ملک کا حصہ سمجھ سکتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا الجزائر بھی اس پوزیشن کو تسلیم کرتا ہے؟ اندازہ یہی ہوتا ہے کہ فرانس سختی ہی سے کام لے گا۔ لیکن اس کا انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اسے اپنی کمزوری کا احساس ہے۔ چنانچہ اس نے سخت گیر پالیسی کے ساتھ ساتھ اصلاحات کی بھی باتیں شروع کردی ہیں۔ فرانسیسی کابینہ نے الجیریا کے لئے جو منصوبہ تیار کیا ہے اس کی چیدہ چیدہ شقیں یہ ہیں (۱) زیادہ سے زیادہ زمین قابل کاشت بنائی جائے۔ اور ایسی زرعی اصلاحات نافذ کی جائیں۔ جن سے زمین کی تقسیم منصفانہ ہوجائے (۲) زیادہ سرمایہ لگا کر صنعتی ترقی کی رفتار تیز تر کی جائے (۳) دو محکموں کا اضافہ کیا جائے (۴) عربی کو فرانسیسی کے ساتھ دوسری قومی زبان تسلیم کیا جائے۔ یہ اصلاحات اس اعتبار سے تو اہم ہیں کہ ان سے اہل ملک کا ملکی معیشت میں حصہ اور بڑھ جاتا ہے۔ لیکن اس سے سیاسی آزادی حاصل نہیں ہوتی۔ الجزائر کی جنگ آزادی اب جس مرحلہ میں پہنچ گئی ہے اس کے پیش نظر سیاسی آزادی کہیں زیادہ ضروری ہے۔ فرانس کو اس سلسلے میں کم سے کم یہ کرنا چاہیئے کہ ٹیونس کے برابر الجزائر اور مراقش کو داخلی آزادی دے دے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو جبر و تشدد سے بغاوت کی آگ کو فرو نہیں کیا جاسکیگا۔

غازہ میں مصری اسرائیلی کشیدگی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ دونوں کے مابین تصادم کی خبریں ہر روز آتی رہتی ہیں۔ صورت حال ایسی ہے کہ اس کا نتیجہ جنگ ہوسکتا ہے۔ یہودیوں کی کوشش ہے کہ مصر براہ راست مذاکرات کے لئے

قدم بہ قدم
صحت وشادمانی کی طرف

اچھی صحت اور اچھی قسمت کی بنیاد بچپن ہی میں رکھی جاتی ہے
اپنے بچے کو غذا کی کمی اور موسمی علالتوں کا شکار نہ ہونے دیجئے۔

بچوں کی صحت کا محافظ
نونہال
ہمدرد

"نونہال وہ صحت بخش ٹانک ہے جو آپکے بچے کے قویٰ کو مضبوط کرتا ہے اس کے بڑھنے اور پنپنے میں مدد گار اعضاء کی آئندہ ترقی کا ضامن ہے۔ اس میں وہ تمام قدرتی اجزاء موجود ہیں جن کی بچوں کے جسم اور دماغ کو ضرورت ہوتی ہے۔

تیار ہو جائے۔ لیکن مصر اقوام متحدہ کے نمائندے کی وساطت کے بغیر گفتگو کے لئے آمادہ نہیں۔ اگر متحدہ اقوام کی نگرانی میں ایسی ملاقات جلد نہ ہوئی اور ہوئی اور اس کا نتیجہ کچھ نہ نکلا تو جنگ ناگزیر ہو جائے گی۔ تمام عرب ممالک نے مصر کو یقین دلایا ہے کہ وہ جنگ کی صورت میں اس کا ساتھ دیں گے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اگر ایسا وقت آیا تو عربی اتحاد کہاں تک موثر ثابت ہو گا۔ ۱۹۴۸ء کی جنگ فلسطین میں عرب اقوام میں اس قدر پھوٹ تھی کہ جنگ میں شریک ہونے کے باوجود وہ پوری طرح تعاون نہیں کر سکے تھے اور شکست کھا گئے تھے۔ مصر اس شکست کو نہیں بھولا۔ یوں بھی ان دنوں دنیائے عرب میں اتحاد مفقود ہے۔ اس کا نتیجہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عرب یہودی جنگ کی صورت میں متفرق رہیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سابقہ شکست کے پیش نظر وہ واقعی متحد و منظم ہو جائیں۔ مصر کو بہرحال اپنی تنہائی کا احساس ہے۔ اور وہ اسی حیثیت سے جنگ کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔

یمن اپریل میں ایک خونین انقلاب میں مبتلا ہوتے ہوتے بچا تھا۔ جب اس کے حکمران امام احمد کو ان کے بھائیوں نے تخت سے معزول کرنے کی کوشش کی تھی اور وہ دونوں ناکام ہو کر قتل ہو گئے تھے۔ اب وہاں پھر کچھ تبدیلیوں کے آثار نظر آ رہے ہیں۔ قاہرہ میں متعین یمنی سفیر نے اعلان کیا ہے کہ وزیر اعظم سیف الاسلام الحسن کو وزارت عظمیٰ سے ہٹا دیا گیا ہے۔ اب وہ محض امیر یمن کے مشیر ہیں۔ الحسن جنوری سے ملک سے باہر ہیں۔ وہ بنڈونگ کانفرنس میں شریک ہوئے۔ پھر وہاں سے جاپان ہوتے ہوئے ان دنوں اپنے ملک کی نمائندگی کرنے کے لئے سان فرانسسکو پہنچ گئے ہیں۔ اعلان میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ امیر یمن عنقریب حکومت کی تشکیل نو کریں گے۔ یہ تشکیل کیوں ہو گی اور اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کے متعلق کچھ معلوم نہیں۔ اتنا یقینی ہے کہ یہ ہیجان شدید خاندانی مناقشات کا بین ثبوت ہے۔

انڈونیشیا آزادی کے بعد پہلے عمومی انتخابات کی تیاریوں میں مصروف ہے۔ یہ انتخابات ۲۹ ستمبر کو ہو رہے ہیں۔ اس کے ایک ماہ بعد یعنی دسمبر میں ایک مجلس دستور ساز منتخب کی جائے گی جو ملک کا آئین تیار کرے گی۔ اب تک مجلس دستور ساز معرض وجود میں نہیں آ سکی۔ کیونکہ ملک میں عمومی حالات ایسے نہیں کہ عام انتخابات کرائے جائیں۔ گو حالات اب بھی تسلی بخش نہیں ہیں۔ لیکن اتنے بہتر ضرور ہیں کہ انتخابات کے مرحلے سے گذرا جا سکے۔ انڈونیشیا جیسے ملک میں انتخابات جمہوری آسان کام نہیں کیونکہ آبادی منتشر بھی ہے۔ اور سیاسی شعور سے محروم بھی ہے۔ حکومت عوام کو انتخابات کی اہمیت و افادیت کو پروپیگنڈے کے ہر ممکن طریقے سے آگاہ کر رہی ہے۔ پارٹیاں بھی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ گزشتہ دنوں چار مسلمان جماعتوں نے یہ اعلان کیا ہے کہ وہ اس کا خیال رکھیں گے کہ سیاسی اختلافات سے وحدت اسلامیہ پارہ پارہ نہ ہو۔ وہ دیگر مسلمان جماعتوں پر طعن نہیں کریں گے اور تمام انڈونیشی باشندوں سے درخواست کریں گے کہ وہ حکومت سے تعاون کا ثبوت دیں۔ یہ فیصلہ خوش آئند ہے۔ اگر اس کی بجائے سیاسی جماعتوں کا مشترکہ محاذ بن جاتا تو وہ مشکل ملک کے لئے زیادہ مفید ہوتی۔ لیکن اگر

نیکو وال

(صفحہ ۷ سے آگے)

پاکستان کے انبال جرم سے تعبیر کیا۔ آپ نے دہلی میں یہ کچھ کہا لیکن اس کے بعد جب اس مہینے میں یہ خبر آئی کہ ہندوستان نے نیکو وال پر قبضہ کر لیا ہے۔ تو آپ نے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ وہ انسائیکلو پیڈیا نہیں ہیں کہ انھیں معلوم ہو کہ نیکو وال پر قبضہ ہو چکا ہے یا نہیں۔ اگر ہمارے وزیر اعظم کا انداز گفتگو یہ ہو تو ہندوستان کا رویہ جتنا بھی متشدد ہو قابل فہم ہے۔ کیا ہم توقع کریں کہ اب بھی وزیر اعظم صحیح صورت حال سے ملک کو مطلع کریں گے؟ انھیں معلوم ہونا چاہیئے کہ کوئی محب وطن پاکستانی اپنے وطن عزیز کے ایک انچ حصہ کو بھی ہندوستان کے تصرف میں دیکھنا گوارا نہیں کر سکتا۔

بین الاقوامی جائزہ

(صفحہ ۱۶ سے آگے)

لیکن نعرے لگانے سے باز نہیں آئیں گے۔ حکومت کی طرف سے مورچے کو ناکام بنانے کے لئے طرح طرح کی چالیں چلی جا رہی ہیں۔ یہاں تک کہا گیا ہے کہ سکھوں نے یہ مورچہ پاکستان کی شہ پر شروع کیا ہے۔ اس الزام نے سکھوں کو اور مشتعل کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ خود سکھوں کو ہی ابھارا جا رہا ہے کہ وہ مورچے کے خلاف اس بنا پر مورچہ لگائیں کہ اکالی گوردواروں کا ناجائز استعمال کر رہے ہیں۔ ابھی تک حکومت کو اس ضمن میں کوئی کامیابی حاصل نہیں ہو سکی۔

بزم طلوع اسلام

چکوال اشرف سروری صاحب، ترجمان بزم طلوع اسلام سروری کالج، چکوال (ضلع جہلم) اطلاع دیتے ہیں کہ بزم اگست ۱۹۵۳ء سے مصروف عمل ہے۔ اور قرآنی فکر کی ترویج و اشاعت میں منہمک۔ اس بزم کی سرگرمیوں کی تفصیل بعد میں شائع کی جائے گی۔

جلال پور جٹاں رائے محمد اکبر صاحب پنشنر، پاکستانی محلہ جلال پور جٹاں (ضلع جہلم) لکھتے ہیں کہ وہ بزم طلوع اسلام کی تشکیل کے لئے کوشاں ہیں۔ اس کے لئے انھوں نے مقامی قارئین کا اجلاس طلب کیا ہے۔ توقع ہے کہ جملہ احباب ان سے پورا تعاون کریں گے۔ اور جلد سے جلد بزم کی تشکیل کر لیں گے۔

ملتان اختر علی صاحب معرفت شاہ محمد اینڈ سنز آٹوموبائل انجینیئرز، بیرون پاک دروازہ ملتان۔ مقامی قارئین سے فرداً فرداً مل کر تشکیل بزم کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ قارئین سے التماس ہے کہ وہ بہ عجلت تمام بزم طلوع اسلام متشکل کریں اور قرآنی فکر کی ترویج کے فریضہ کی ادائیگی میں مصروف ہو جائیں۔

قرانی فکر کی نشر و اشاعت

آپ اس میں کس طرح حصہ لے سکتے ھیں

طلوع اسلام قرانی فکر کی نشر و اشاعت کا ذریعہ ھے۔ ظاھر ھے کہ اسکا لٹریچر جسقدر زیادہ شائع ھوگا اسی قدر قرانی فکر عام ھوگا اور اسی نسبت سے قرانی انقلاب قریب سے قریب تر آتا جائیگا۔ اس کے لئے طلوع اسلام نے "پیشگی خریداران" کی اسکیم جاری کی ھے۔ یعنی اگر آپ ایک سو روپیہ پیشگی ادا کردیں (یک مشت یا دس روپے* کی ماھانہ اقساط میں) تو آپ کا حساب کھول لیا جائیگا اور اس میں سے آپ کو طلوع اسلام کی شائع کردہ کتابیں بلا محصول ڈاک گھر بیٹھے ملتی جائینگی تا آنکہ آپ کی پیشگی رقم پوری نہ ھوجائے۔ اس طرح - - -

- آپ کی پیشگی رقم سے ھمیں مزید کتابیں شائع کرنے میں سہولت مل جائیگی۔ اور
- آپ کو طلوع اسلام کی کتابیں بلا محصول ڈاک خود بخود ملتی چلی جائینگی۔ اگر آپ اس وقت تک اس اسکیم میں شامل نہیں ھوئے تو اب شامل ھوجائیے۔

* پہلے ماھانہ قسط کی رقم کم سے کم پچیس روپے تھی لیکن اب متعدد قارئین کے اصرار پر اسے بدل کر دس روپے کر دیا گیا ھے۔ جو احباب دس روپے سے زیادہ قسطیں دینا چاھیں وہ دے سکتے ھیں۔

معاملہ کی ضروری باتیں

* طلوع اسلام آپ کا اپنا ادارہ ہے اس لئے اس سے اسی طرح کا برتاؤ کیجئے جس طرح اپنوں سے برتاؤ کیا جاتا ھے۔ یہ بھی آپ سے ایسا ھی برتاؤ کریگا۔
* حساب میں بعض اوقات غلطی ھوسکتی ھے۔ ایسی غلطی باھمی افہام و تفہیم سے صاف کرلیجیے۔
* رسالہ کے انتظامی معاملات کے متعلق الگ خط لکھئے۔ کتابوں کے لئے الگ۔
* مضامین کے متعلق مدیر کے نام علحدہ خط لکھئے۔ نیز استفسارات مدیر کے نام الگ بھیجئے۔
* پتہ کی تبدیلی سے کم از کم دو ھفتہ پہلے اطلاع دیجئے۔
* پرچہ نہ ملنے کی اطلاع تاریخ اشاعت کے ایک ھفتہ کے اندر دیجئے۔ بعد میں رسالہ قیمتاً بھیجا جائیگا۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام - پوسٹ بکس نمبر ۲۱۳۷ - کراچی - ۳

الصلوۃ اور الزکوۃ

تانا بانا

ھیں اس قرآنی معاشرے کا جس کا ہر فرد

مستقل اقدار

کو اپنے اندر سموئے دل کی مرضی اور روح
کی خوشنودی سے دوسروں کے لئے سامان نشو و نما
بہم پہنچانے کی فکر میں لگ جائے ۔

یہ معاشرہ

کیسے قائم ہو سکتا ھے؟

اس کا جواب

☆ نظام ربوبیت ☆

(از - پرویز)

میں ملاحظہ کیجئے ۔

دور حاضرہ کی عظیم کتاب ۔

قسم اول : کاغذ سفید کرنافلی جلد مضبوط مع گردپوش - چھ روپے

قسم دوم : کاغذ میکانیکل صرف گرد پوش کے ساتھ - چار روپے

ناظم ادارہ طلوع اسلام - پوسٹ بکس نمبر ۳۱۳ ء - کراچی-۳

Title Printed at Mueid Art Press, Thathai Compound, Bunder Road, Karachi. Text at Jawed Press, McLeod Road, Karachi. Published by Khurshid Alam from Tolu-e-Islam Office, 23/1 Fowler Lines, Napier Barracks, Karachi.

Editor: KHURSHID ALAM